نوبل انعام یافتہ ادیب (2021)
یادِ مفارقت
(مشرقی افریقہ کا ناول)
عبد الرّزاق گُرناہ
ترجمہ
سید سعید نقوی
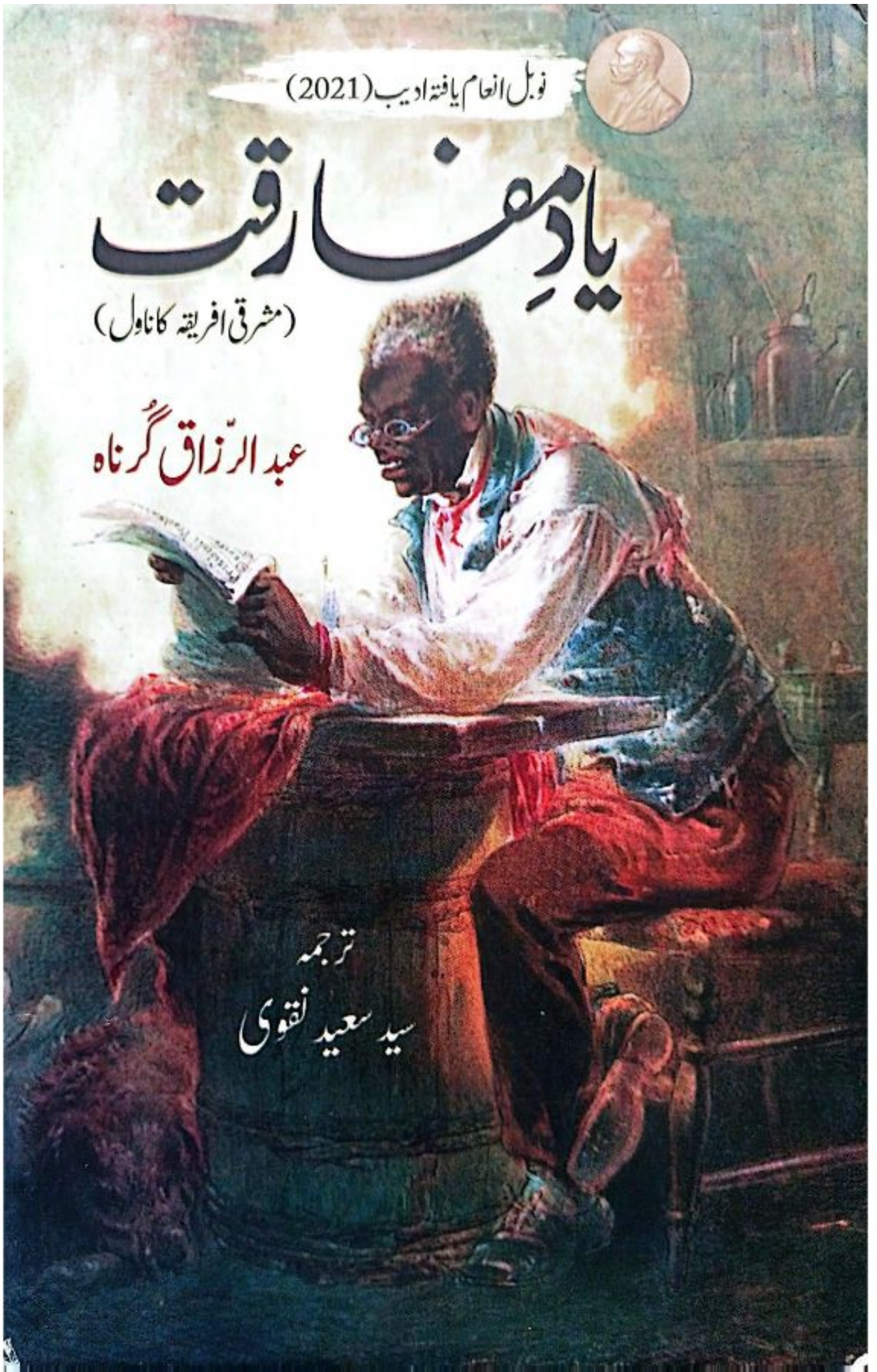
مترجم کی دیگر تصانیف

افسانوں کے مجموعے

☆نامہ بر☆ دوسرا رُخ

☆ٹک ٹک دیدم☆ ڈھائی خانے کی چال

☆مغرب میں اردو افسانہ (تحقیق و ترتیب)

ناول

☆گرداب ☆بارش سے پہلے

شعری مجموعہ

دامِ خیال

انگریزی سے تراجم

☆منگل والے لوگ (ناول)

☆سکوت (عالمی ادب سے افسانوں کا انتخاب)

☆یادِ مفارقت (ناول)

☆جینیات کی ان کہی تاریخ (نان فکشن)

☆فریبِ نظر (عالمی ادب سے انتخاب)

☆اسٹونر (ناول)

☆مستقبل کی تاریخ (نان فکشن)

☆بندہ بشر (نان فکشن) ☆دلاری (ناول) ☆دو نیم اپریل

☆اشتعال کی فصل (ناول) ☆انڈیا کا ایک سفر

☆وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت ☆مضحکہ خیز محبتیں

اُردو سے انگریزی ترجمہ

In Search Of Butterflies

(منتخب ہم عصر اُردو افسانے)

بچوں کے تراجم

☆ہوائے ☆چاکی اور دریا ☆ننھا شہزادہ

سفرنامہ

زادِ راہ (سفرنامہ)

(مشرقی افریقہ کا ناول)Memory Of Departure

یادِ مُفارقت

مصنف: عبدالرزاق گرناہ

ترجمہ: سید سعید نقوی

City Book Point

Naveed Square, Urdu Bazar
Near Muqadus Mosque Karachi
Ph: 32762483
Email: citybookurdubazaar@gmail.com
Facebook: citybookpoint

باذوق لوگوں کے لئے خوبصورت اور معیاری کتاب

بیاد

HASAN-DEEN

نام کتاب : یادِ مُفارقت

مصنف : عبدالرزاق گرناہ

ترجمہ : سید سعید نقوی

تعداد : 500

اشاعت : 2022ء

قیمت : 600روپے

تعارف

صورت حال یہ ہے کہ تمام نوآبادیاتی علاقے آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنے آپ کو غربت، جہالت اور کرپشن میں محصور پاتے ہیں۔ یہی تو وہ ہتھیار ہیں جن کے استعمال سے استعماری سامراج ایشیا، افریقہ اور جزائر الہند کے بیش تر علاقوں پر قابض رہا۔لہذا ان حاکموں کے چلے جانے کے بعد بھی یہ مفتوحہ علاقے کسی حد تک پرانے حاکموں کے دست نگر رہتے ہیں۔صدیوں سے ان علاقوں میں رشوت، لاقانونیت اور قیادت کے بحران کی حکمرانی رہی ہے۔اس دلدل سے نکلنے میں خود ایک صدی لگ جاتی ہے۔ایسے میں کیا عجب ہے کہ ایک تازہ واردِ بساط ہوائے دل کو ان کی کہی اپنی اپنی سی لگے۔تو عبدلرزاق گورناہ کی کتاب بھی میری حسیات پر اسی نیرنگی وآب وتاب سے اتری جیسے شوکت صدیقی، سعادت منٹو یا انتظار حسین کی کتابیں اثر انداز ہوتی تھیں۔کالونیل نظام کو اتار پھینکنے کے بعد اقوامِ محکوم کو جن حالات کا سامنا کرنا پڑا وہ پوسٹ کولونیل لٹریچر کی صورت میں ہم تک پہنچا۔عبدالرزاق گورناہ اس سلسلے کا ایک اہم نام ہے۔

گورناہ تنزانیہ کے علاقے زنزی بار (جسے ہم زنجبار کہتے ہیں) میں 1948 میں پیدا ہوئے۔انگلستان کی کینٹ یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آخر وہیں شعبہ انگریزی میں پروفیسر اور ڈائریکٹر کی حیثیت سے منسلک ہو گئے۔گورناہ کے اب تک آٹھ ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔وہ واسافری نامی رسالے کے ایسوسیٹ ایڈیٹر بھی ہیں۔

نوآبادیاتی دور اور اس کے بعد پیدا ہونے والے مسائل ان کی خاص دلچسپی کا موضوع رہے۔خصوصا افریقہ، ہند اور جزائر الہند میں کالونیل نظام سے جو غربت، جہالت، جبر اور

احساسِ محکومیت پیدا ہوا۔ پھر غیر ملکی حاکموں کے زوال کے بعد سیاسی خلا، جوڑ توڑ، قیادت کے فقدان اور معاشرتی بدحالی ان کہانیوں کا پس منظر بنے۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول و معروف ناول پیراڈائز کے عنوان سے 1994 میں شائع ہوئی۔ یہ پہلی جنگِ عظیم میں مشرقی افریقہ پر برطانوی تسلط کے زمانے کی کہانی ہے۔ اس ناول کو بکرُ انعام کے لیئے بھی شارٹ لسٹ کیا گیا تھا۔

"یاد مفارقت" بھی ایک پندرہ برس کے نوجوان کی کہانی ہے، جو مشرقی افریقہ کے ایک غریب ساحلی علاقے میں پیدا ہوا۔ اس کے اطراف محض غربت، مایوسی، کرپشن اور ہر قسم کی بے راہ روی مروج ہے۔ یہ ایسے گھرانے کی کہانی ہے جس کا ہر فرد اس ماحول کا شکار ہوا ہے، لیکن ہر ایک اپنے انفرادی انداز میں اس کا اثر قبول کرتا ہے اس کا باپ اپنی ناکامیاں شراب میں ڈبو کر اور اپنی اولاد پر تشدد کر کے۔ وہ اپنے گھرانے کا ایک جابر، ناکام، غصہ ور حکمران نظر آتا ہے۔ اس کی بہن غیر مردوں کی بانہوں میں فرار کی راہ تلاش کرتی ہے۔ اس کی ماں ایک روایتی، شکست خوردہ مظلوم عورت، اپنے گھر کا بنیادی ڈھانچہ قائم رکھنے کی کوشش میں خاموشی سے سب سہے جا رہی ہے۔ شوہر کے ہاتھوں جسمانی تشدد اور بے عزتی کے ساتھ وہ کیسے اپنی اولادوں کے سامنے اپنا وقار برقرار رکھنے کی کوشش میں ہراساں نظر آتی ہے۔ اس خاندان کے تمام افراد ایک دوسرے سے شرمندہ ہیں۔ لیکن کسی نہ کسی سطح پر ان کی امیدیں نوجوان حسن کی امنگوں سے وابستہ ہیں۔ حسن کے خیالات بلند اور مقصد واضح ہیں۔ لیکن وہ اکیلا اس منزل تک نہیں پہنچنا چاہتا بلکہ اپنے اطراف اور اپنے ماحول کو بھی مایوسی اور مفلسی کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہے۔ یہ ماحول پوسٹ کالونیل معاشروں کا "نارمل" ہے، اتنا نارمل کہ ہمیں آئینے کا شبہ ہوتا ہے۔ یہی آفاقیت، ایک اچھے ناول نگار کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ ہر اہم ناول کی طرح یہ بھی ایک محبت کی داستان ہے۔ مختصر سے ناول میں گورناہ نے امیدوں، جذبوں اور نئی غیر آلودہ نسل کے دامن سے بہت سی امیدیں باندھ لی ہیں۔ پڑھیے اور لطف اٹھایئے۔

سیّد سعید نقوی

(۱)

میری اماں صحن میں آگ روشن کر رہی تھیں۔ میرے باہر نکلنے تک ان کی مناجاتوں کے کچھ حصے میرے کانوں تک پہنچتے رہے۔ وہ سر جھکائے انگیٹھی میں پھونک مار کے کوئلوں میں آگ بھڑکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ پانی کا برتن ان کے پاؤں کے پاس بھرا رکھا تھا۔ انھوں نے مڑ کے میری جانب دیکھا تو آگ سے ان کا چہرا تمتمایا نظر آیا، آنکھوں میں دھویں سے آنسو اتر آئے تھے۔ میں نے ان سے روٹی کے لیے پیسے مانگے تو ان کی تیوریوں پر ایسے بل پڑ گئے جیسے انھیں آگ جلانے میں مداخلت ناگوار گزری ہو۔ انھوں نے لباس کے چالی بند میں ہاتھ ڈال کر وہ گرہ بندھا رومال نکالا، جس میں وہ پیسے رکھتی تھیں۔ میرے ہاتھ پر انھوں نے جو سکّے رکھے اس میں ابھی تک ان کے جسم کی حدت و نرماہٹ موجود تھی، جیسے وہ سکّے کونے جھاڑ کے گول ہو گئے ہوں۔

'زیادہ دیر مت لگانا' یہ کہہ کر وہ واپس آگ کی جانب مڑ گئیں، نظر اٹھا کے میرے چہرے کی جانب دیکھا تک نہیں۔ میں بھی سلام کیے بغیر ہی نکل گیا لیکن پھر فوراً ہی اپنی عجلت پر افسوس بھی ہوا۔ اس وقت وہ چوتھی دہائی میں تھیں لیکن اپنی عمر سے بڑی لگتیں۔ ان کے بالوں میں ابھی سے چاندی ابھر آئی تھی، چہرے پر بھی زمانے کی سختیوں نے آثار چھوڑ دیے تھے۔ ان

کی نظروں میں اکثر ملامت بھری رہتی اور لاپروائی کا کوئی معمولی عمل بھی ان میں آزردگی بھی بھر دیتا۔ کبھی ان کے چہرے پر زندگی کی مسکراہٹ بھی لوٹ آتی لیکن بہت دھیمی، ہچکچاہٹ کے ساتھ۔ میں ان کی حالت پر شرمندگی محسوس کرتا، لیکن میرا خیال تھا کہ وہ میری نوجوانی میں قدم رکھنے کا مسکرا کے استقبال کریں گی۔

میں گھر کی بغل میں تاریک گلی سے گزرا۔ دبیز اوس نے ہوا میں موجود گرد کو جما دیا تھا، سڑک کے کنارے جھگیوں کی ٹین کی چھتوں کو صیقل کر دیا تھا۔ جا بجا گڑھوں سے داغدار ہونے کے باوجود سڑک مٹی کی ان جھگیوں سے زیادہ ہموار اور مضبوط لگ رہی تھی، جو اس کے دو رویہ کھڑی تھیں۔ یہ کینگی (Kenge) تھا، جہاں محنت کش و نامراد لوگ رہتے تھے، جہاں دیدہ طوائفیں اور رنگ دار ہیجڑے تجارت کرتے تھے، جہاں بدمست شرابی سستی شراب کی تلاش میں آتے۔ جہاں کی گلیاں راتوں کو بے نام درد کی کراہ سے گونجا کرتی تھیں۔ ٹوٹی سڑک پر کھڑکھڑاتی، کراہتی ایک خالی بس پاس سے گزری۔ اس پر سفید اور سبز رنگ پینٹ کیا ہوا تھا۔ صبح کی روشنی میں اس کی ہیڈ لائٹس کمزور اور پیلی لگ رہی تھیں۔

زمباراؤ (Mzambarau) درخت کے اطراف چھوٹا سا میدان اتنے سویرے خالی تھا۔ سبز مسجد سے نماز کی آواز ابھر رہی تھی۔ ایمان والے معافی کی امید میں جمع تھے۔ دور کہیں ایک مرغ نے بانگ دی۔ چوراہے کی زمین سے کھردرے پتھروں نے سر اٹھا کے غافل قدموں کے لیے خطرات پیدا کر دیے تھے۔ بارش کے بعد یہی زمین نئی گھاس سے سبز ہو جائے گی، لیکن فی الحال تو ہم خشک موسم کے دور سے گزر رہے تھے۔

کینگی سمندر سے بہت نزدیک تھا، اس کا مزا ہمیشہ ہوا میں موجود رہتا۔ مرطوب دنوں میں ناک اور کان پر جیسے نمک کی ایک لکیر سی کھنچ جاتی۔ جب کہ خوش گوار صبحوں میں سمندری ہوا نئے دنوں کا آغاز دلوں کو ٹھنڈا کر کے کرتی۔ گزرے دنوں میں غلاموں کے سوداگر ان گلیوں سے گزرتے تھے۔ کینہ سے سیاہ دل، ان کے ساتھ عمدہ گوشت کی ایک قطار چل رہی ہوتی، وہ اپنی دولت کا یہ ریوڑ سمندر تک لاتے۔

یمنی دکان دار نے کوئی لفظ بھی کہے بغیر مجھے روٹی پکڑا دی۔ پیسے قبول کرنے سے پہلے

اس نے اپنی قمیض سے ہاتھ صاف کیے، یہ پیسے کو اس کا درویشانہ احترام تھا۔ اس کے چہرے پر ایک جی حضوری مسکراہٹ کھیلتی رہتی لیکن زیرِلب وہ کوستا رہتا۔

جب میں گھر واپس لوٹا تو والد کو نماز پڑھتے پایا۔ وہ عقبی صحن میں زانو تہہ کیے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور سر سینے پر جھکا ہوا تھا۔ مٹھیوں میں بند ہاتھ گھٹنوں پر رکھے تھے، اور شہادت کی انگلی زمین کی جانب سیدھی تھی۔

میں نے ڈبل روٹی کاٹی اور پھر اپنی بہنوں کو بیدار کرنے چل دیا۔ وہ میری دادی کے کمرے میں سوتی تھیں، جس کی دیواریں پسینے اور بغلوں کی نمی سے مرطوب رہتیں۔ ان کا سکڑا بدن مڑا تڑا پڑا تھا، بازو بستر سے باہر جھول رہے تھے۔ ذکیہ ان کے برابر لیٹی تھی۔ وہ دونوں بہنوں میں بڑی تھی، اور پہلے ہی بیدار ہو چکی تھی۔ سعیدہ کو بیدار کرنا ہمیشہ دشوار ہوتا۔ میں نے اسے ہلایا تو اس نے پیٹھ موڑ کے دوسری جانب کروٹ بدل لی، اور ناراضی سے بڑبڑانے لگی، میں بھی جھلا گیا اور آخر اس کے شانے پکڑ کے اسے جھنجوڑا۔

'ارے کیا کر رہے ہو؟' میری دادی جو سعیدہ کی بڑبڑاہٹ سے بیدار ہو گئی تھیں، چلّائیں۔ 'احتیاط سے، کیا مارنا ہے ہم سب کو، ارے احتیاط سے، سنتا نہیں کیا؟'

ہم انھیں بی کبوا کہتے تھے، بڑی مالکن۔ وہ بہ ظاہر بہت نحیف اور مہربان لگتیں، لیکن درحقیقت بے رحم اور سنگ دل تھیں۔ میں جانے کے لیے مڑا تو عقب سے ان کی بڑبڑانے کی آواز آتی رہی: 'کچھ بولیں گے نہیں، سلام دعا کی زحمت نہیں، واپس آؤ یہاں! وہ اچانک چیخیں 'لید کے مختصر ڈھیر، کیا سمجھتے ہو تم مجھے، فوراً واپس آؤ یہاں!' ان کی چیخ و پکار ختم ہونے کے انتظار میں، میں پچھلے دروازے کے باہر کھڑا ہو گیا، میں نے سنا وہ رو رو کے میرے باپ کو پکار رہی تھیں ایک ایسی آواز میں، جیسے کوئی بہت تکلیف میں مبتلا ہو۔ وہ اب بھی میرے سامنے بیٹھے نماز ادا کر رہے تھے۔ میری ماں نے ان کی طرف دیکھا، مگر انھوں نے اپنے اطراف کی چیخ و پکار سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ ماں نے میری طرف دیکھ کر سر ہلایا 'تم نے پھر شروع کر دیا' وہ میری کتابیں لینے لپک کے اندر گئیں اور چند لمحوں مجھے والد کے پاس اکیلا چھوڑ دیا۔ انھوں نے مجھے روٹی کا ایک سلائس دیا اور چائے کے لیے ایک پینی۔ یہ میری پندرھویں سال گرہ کی صبح تھی۔

قرآنی مدرسے میں جہاں میں پانچ برس کی عمر سے جا رہا تھا، میں نے سنا تھا کہ لڑکے پندرہ سال کی عمر میں خدا کے سامنے جواب دہ ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں نو برس کی عمر میں ہی اس بلوغت کو پہنچ جاتی ہیں۔ یہ کوئی رطوبتوں کے اخراج وغیرہ کا معاملہ تھا، بہ ہر حال یہی حکمِ خداوندی تھا۔

'جب تم پندرہ سال کے ہو جاؤ گے' میرے والد نے مجھے بتایا تھا 'تو معاملہ تمھارے اور خدا کے درمیان ہوگا۔ جو بھی گناہ کرو گے فرشتے تمھارے حساب میں درج کریں گے۔ قیامت کے دن تمھارے گناہوں کو تمھاری نیکیوں کے مقابلے میں تولا جائے گا۔ اگر تم خدا کے بتائے راستے پر چلو گے تو جنت میں جاؤ گے، اگر گناہ کرو گے تو جہنم کی آگ میں جلو گے۔ تمھاری ہڈیاں تک جل کر خاک ہو جائیں گی، پھر تم اس خاک سے دوبارہ جنم لو گے اور پھر جلائے جاؤ گے۔ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لیے ایسے ہی چلتا رہے گا۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ ہمیں پانچ وقت نماز ادا کرنی چاہیے، رمضان میں روزے رکھنے چاہییں، ہر سال زکواۃ ادا کرنی چاہیے، اور اگر خدا ہمت دے تو زندگی میں ایک بار مکہ ضرور جانا چاہیے۔ خدا نے جہنم کی سات گہرائیاں رکھی ہیں۔ سب سے پستی میں جھوٹے اور منافق ہیں یعنی وہ جو پارسا بنتے ہیں مگر دل میں شبہ رکھتے ہیں۔

'تمھیں ہر روز شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے تمھیں کافر یا وحشی پیدا نہیں کیا۔ بلکہ تمھیں ایسے والدین کے گھر پیدا کیا جو تمھیں اس کی حمد و ثنا سکھا سکیں۔ تم خدا کی مخلوق میں ماننے والوں میں شمار ہو۔ کچھ سالوں میں تم پندرہ برس کے بن جاؤ گے، ایک مرد بن جاؤ گے، ابھی سے اس کی فرماں برداری سیکھ لو،، ورنہ ہمیشہ جہنم کی آگ میں جلو گے۔'

جس دن میں پندرہ برس کا ہوا، اس دن بھی مجھے وہی بس اسکول لے گئی جو روز لے جاتی تھی۔ میرے ساتھ بس میں بھی وہی چہرے تھے، وہی لڑکیاں ہم سے الگ بیٹھی ہوئی تھیں، جنھیں ایسے اٹھایا گیا تھا کہ وہ مردوں کی موجودگی میں ایک عجیب طرح کی خود آگاہی کے اضطراب میں گرفتار ہو جاتیں۔ میں نے ان میں اسے ڈھونڈا جو مجھے پسند تھی، بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایسے کرختگی سے بیٹھتی کہ میری خواہشات بے ہمت ہو جاتیں۔ اس کے بازو میں بیٹھی لڑکی زیادہ نرم خو لگتی۔ وہ میرے آگے ہی بیٹھی ہوئی تھیں لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کا نام ہی پوچھ لیتا۔ مجھے وہ خواب آور راتیں یاد آنے لگیں جن میں

خون گرم ہو جاتا ہے۔۔۔۔اس صبح میں ایک مرد بن کر بیدار ہوا۔

اسکول سے واپسی پر میں سفیدی ہوئی مسجد کے اداس ماحول میں داخل ہو گیا۔فرش پر جماعت کے لیے خوش رنگ چٹائی بچھی تھی۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا اور خدا سے اپنے حساب کا کھاتا کھول لیا۔

پیروں کی دھول گرد و غبار کے بادل اٹھا رہی تھی۔ سر پھرے درخت دوپہر کے سورج میں تمتما رہے تھے۔گرمی کی طاقت کے دباؤ میں سمندر کروٹیں بدل بدل کے اڑ رہا تھا ضائع ہو رہا تھا، نمی اور آبی بخارات میں ڈھل رہا تھا۔سورج ڈوبنے کے بعد جو خنکی ہوتی اسے جما دیتا۔

ساحل کے قریب مجھے مچھلی مارکیٹ کی بو آنے لگی۔اب بھی کچھ مچھیرے باقی تھے۔ان میں سے بیشتر ساری رات کام کرتے اور پھر صبح کی اذان کے ساتھ گھر چلے جاتے۔ ہر رات وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں پانی میں اتارتے اور سمندر میں کھو جاتے۔ان میں سے کئی تو بہت روز تک نہ لوٹتے، اور پھر کسی شارک یا خار ماہی کے ساتھ لوٹتے جسے انھوں نے فتح کیا ہوتا۔جب میں چھوٹا تھا تو یہ مجھے بہت پر کشش اور آزاد زندگی لگتی تھی، ایک مرد کی زندگی۔

سمندر سے اٹھنے والی نمکین ہوا نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔بندرگاہ کی بو، پشتے کے موڑ پر، جانوروں کے ٹاپوں کا شور۔ وہ جزیروں کے لیے جانور لاد رہے تھے۔ جزیروں پر جانور سی سی (Tsetse) مکھی کا شکار ہو جاتے۔لہٰذا ہر مہینے مقامی تاجر بیمار ضعیف گائے کشتی میں لاد کے اس پار لے جاتے۔

میں نے بوڑھے باقری کو کیچڑ زدہ ساحل سے سیڑھیوں کی جانب جاتے دیکھا۔جب میں چھوٹا تھا تو باقری مجھے سمندر اور مچھیروں کے بارے میں بتایا کرتا۔وہ ہمیشہ مجھ سے مہربانی سے پیش آتا۔کبھی وہ مجھے بھنی مچھلی یا اروی گھر لے جانے کے لیے دے دیتا۔وہ کہتا کہ سمندر سے اسے خوف آتا ہے۔لوگ حقیقت میں سمندر کو جانتے نہیں، ایک عفریت، وہ کہا کرتا 'گہرا، گہرا، اتنا گہرا کہ تم یقین نہیں کرو گے۔اس میں پہاڑیاں ہیں، انسانی ڈھانچے، اور ان پر پلنے والی شارک۔آبی پرندوں کی تیز آواز، جیسے موت کا کنواں'۔اس کا جسم کسی زخمی، بدہیئت عضو کی مانند تھا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کے ایک لمحہ میری جانب دیکھا اور پھر اس کے چہرے پر

مسکراہٹ پھیل گئی۔

'کیسے ہو؟' اس نے پوچھا 'اور تمھارے ابا، تمھاری اماں؟'

'اھلاً باقری، وہ سب خیریت سے ہیں۔'

'اور اسکول؟ تم اچھے نمبر لا رہے ہو ناں؟۔ ایک دن تم ڈاکٹر بنوگے' وہ ہنسا

'ہاں سب ٹھیک ہے'

اس نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا۔

'الحمدللہ، خدا کی ان نعمتوں کے لیے الحمد اللہ کہا کرو' وہ کہہ کر میرا انتظار کرنے لگا کہ میں بھی خدا کا شکر ادا کروں۔

'اچھا بھئی، میرا تو سونے کا وقت ہو گیا ہے، اپنے والدین کو میری تہنیت پہنچانا' وہ، جھکا ہوا، خمیدہ بوڑھا ہاتھ ہلا کر چل دیا۔

کبھی باقری غصے میں پاگل ہو جاتا، وہ اپنے بیوی، بچوں کو مارتا۔ ایک بار اس نے اپنی زوجہ کو نذرِ آتش کر دیا۔ ایک دفعہ اپنی بیٹی پر کرسی توڑ دی، اسے اب بھی چکر آتے ہیں اور وہ بہ مشکل صحیح طریقے سے بول پاتی ہے۔ بعد میں وہ بہت شرمندہ ہوتا، خدا سے گڑگڑا کے موت مانگتا، اپنے خاندان سے معاف کر دینے کی التجا کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیں گے، وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا تھا۔ وہاں قیدیوں پر تشدد کیا جاتا تا کہ معلوم ہو سکے کہ وہ واقعی پاگل ہیں یا محض چھت کی تلاش کے مارے چرب!

باقری کہتا تھا کہ خدا ہی واحد حقیقت ہے اور اگر اس نے باقری کو بیمار ذہن عطا کیا تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔ ہم تو وہی کرتے ہیں جو ہمارے خیال میں درست ہو، جو ہمارے خیال میں خدا کی رضا ہو۔

سمندر کی ہوا میرے سینے کے درد کے لیے اچھی تھی۔ جوار بھاٹا اب ختم ہو رہا تھا۔ مچھیروں کی درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے بنائی کشتیاں مٹی میں اوندھی پڑی تھیں۔ ان کو سہارا دینے والے تختے گھاس پھوس سے آلودہ تھے۔ سبز، کیچڑ بھرے ساحل پر سورج کی تمازت سے بو اٹھ رہی تھی۔ پشتے کے اس پار بندرگاہ پولیس کی ایک لانچ تیزی سے بندرگاہ کی سمت

آ رہی تھی، شاید ایک جہاز آنے والا تھا۔

مجھے پتا تھا کہ اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ میرا تعلق ان لوگوں سے ہے، اگر میں نہیں لوٹا تو وہ مجھے ڈھونڈتے یہاں آ جائیں گے، پھر وہ میری پٹائی کریں گے، مجھ سے محبت جتائیں گے اور مجھے خدا کے فرمان یاد دلائیں گے۔ وہ کمروں کے اندر باہر میرے پیچھے بھاگیں گے، صحن میں بھی میرا تعاقب کریں گے، میرے جسم کو تشدد کا نشانہ بنائیں گے۔ کسی کی نہیں سنتا، اسے ہم سے شرم آتی ہے، اپنے خاندان سے شرم آتی ہے، اب دیکھو اس دروغ گو کو ذرا، نہ جانے یہ ہمیں کس جرم کی سزا ملی ہے؟

'یہ کبھی نہیں سنتا' دادی کہتیں، میرے باپ کے غصے کو اور ہوا دیتیں۔

'کافی سزا مل گئی ہے اسے' میری ماں احتجاج کرتیں، مداخلت کے لیے بے چین رہتیں، اپنے زخمی بیٹے کے لیے مضطرب۔ آخر وہ ناراض ہو کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں۔ اس سب سے کیا حاصل تھا، اس تمام ہنگامے اور بے عزتی کے مقابلے میں تو یہاں گندے ساحل پر ہی بہتر تھا۔

اپنے یونانی ملاحوں اور تھائی لینڈ کے چاولوں سے لدا وہ جہاز قریب ہوتا گیا۔

وہ مجھے جتاتے رہتے کہ جب میں پیدا ہوا تو کتنا کم زور تھا۔ میرا بھائی سعید مجھ سے اٹھارہ مہینے پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام میرے دادا کے نام پر رکھا گیا تھا، جو کسی قسم کے جعل ساز تھے۔ جس دن سعید پیدا ہوا، میرے والد نشے میں دھت ہو گئے اور ایک سینما کے کار پارک میں پڑے ملے۔ میری دادی نے نومولود پر دعائیں دم کیں اور خدا سے دعا کی کہ اسے دوسروں کے حسد سے محفوظ رکھے۔

جب میں پیدا ہوا تو میری ماں بہت درد میں مبتلا رہیں۔ میری دادی نے تجویز کیا کہ کسی کو بلایا جائے جو مجھ پر قرآن کی تلاوت کرے تاکہ خدا مجھے زندہ رکھے۔ انھوں نے مجھے آبِ زم زم سے غسل دیا اور مجھے قرآنی آیات سے کندہ کپڑے میں لپیٹ دیا۔ انھوں نے خدا کو اس بات پر راضی کر لیا کہ مجھے زندہ رہنے دیا جائے۔ تین برس بعد ذکیہ پیدا ہوئی۔ سعید نے اور میں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، ایک بہن بھلا کس کام کی؟ سعید اکثر میری پٹائی کرتا۔ وہ مجھ

سے بڑا تھا۔ کہتا اس سے میں مضبوط ہو جاؤں گا۔ سعید کے بہت سے دوست تھے۔ جب وہ چھ
برس کا ہوا تو اس وقت تک وہ لڑکوں سے جنفتی شروع کر چکا تھا۔ اس نے مجھے آوارہ بلّیاں پکڑنا
اور انھیں چکر دار تار سے مارنا سکھایا۔ ہم چہار دیواری سے گھرے باغات میں گھس کر پھل
چراتے۔ ہم گداگروں اور پاگلوں کو دانہ ڈالتے۔ سعید مجھے دوسرے لڑکوں سے لڑنے پر مجبور کرتا
کہ اس سے میں مضبوط ہو جاؤں گا۔ اکثر وہ تنگ آ کر آخر مجھے ایک طرف ہٹا کر وہ لڑائی خود ختم
کرتا جو میں ہار رہا تھا۔ جب میں خون بہتا، زخمی گھر پہنچتا تو اس کی پٹائی ہوتی۔ آیندہ تم لڑے تو
میں تمھیں قتل کر دوں گا، حرامی، سن رہے ہو میری بات؟ میرے والد اس کی پٹائی کرتے ہوئے
کہتے۔ کچھ دیر بعد میری دادی مداخلت کرتیں۔ میری والدہ مجھے باہر صحن میں لے جاتیں۔ سعید
دادی کے کمرے میں رو رو کے جان دیتا۔ کئی راتیں میرے والد گھر میں بسر نہیں کرتے تھے۔

سعید کبھی خاموش نہیں رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ بحث کرتا، غنڈہ گردی کرتا اور اس پر مار کھاتا۔
جب میری ماں آنسو بھری آنکھوں سے اس سے سدھرنے کو کہتیں تو وہ ہنستا رہتا۔ جب میرے
والد اسے مارتے تو وہ ہمیشہ روتا، درد سے چیختا کمرے میں پھرتا، جہاں والد کی آنکھ بچتی تو وہ
مجھے آنکھ مار دیتا۔

سعید بہت جسیم تھا۔ جب لوگ ہمیں ساتھ دیکھتے تو ڈراتے کہ والد کے انتقال پر وہ مجھے
وراثت سے محروم کر دے گا۔ جب سعید کو مٹھائی کھانے کے لیے پیسے ملتے، تو کبھی وہ اسے
چھوٹے لڑکوں کو کسی خاموش کونے میں نیکر اتارنے پر خرچ کرتا۔ اس نے کوشش کی کہ مجھے بھی
اس میں شریک ہونے پر آمادہ کرے۔ کبھی وہ کسی لڑکے کو میرے پاس لاتا اور کہتا وہ لڑکا اس
بات کا خواہش مند ہے کہ میں اس کے ساتھ جنفتی کھیلوں۔ وہ جلدی سے سرگوشی کرتا۔۔۔ میں
کوشش کرتا کہ میرے اندر بھی اس جیسے جذبات ابھر آئیں، مگر میں اس کے لیے مایوسی کا باعث
تھا۔ میں اپنے پیسوں سے مٹھائی ہی خریدتا، اور اس میں سے نصف اسے دے دیتا۔

ایک دفعہ محلے میں کسی لڑکے کی پٹائی کرنے پر ہم سب گرفتار ہو گئے، سعید نے اسے
ایک درخت سے باندھ کر بید سے اس کی پٹائی کی۔ لڑکے کے والد نے پولیس سارجنٹ سے
ہماری شکایت کی جو ہم سب کو تھانے لے گیا۔ مجھے وہ سارجنٹ اچھا لگا کیوں کہ اس نے ہمیں

تھانے لے جا کر ہتھکڑیوں سے کھیلنے کی اجازت دی۔ اگر وہ کسی چور کو گرفتار کرتا تو ہمیں آفس میں بلا کر اسے ہیڈ کوارٹرز فون کرتے دیکھنے کی اجازت دیتا۔ ہمیں تھانے لے جا کر اس نے ایک بڑی سی کتاب نکالی 'یہاں کچھ لوگوں کے نام ہیں' اس نے کتاب کو پور کے جوڑوں سے بجایا 'یہ لوگ شیطان ہیں۔ ایک دفعہ تمھارا نام یہاں درج ہو جائے تو تمھیں عدالت جانا پڑے گا۔ تمھیں پتا ہے وہ بچوں کے ساتھ عدالت میں کیا سلوک کرتے ہیں؟ وہ انھیں جنگل میں قید کر دیتے ہیں۔'

میری طرف اشارہ کر کے اس نے مجھے گھر جانے کو کہا۔ میں ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر بھاگ نکلا۔ جس سے سارجنٹ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ جب سعید گھر آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ سارجنٹ نے انھیں ایک وارننگ دے کر چھوڑ دیا۔ آخر میں سارجنٹ نے میرے والد کو خبر کر دی۔ سعید کی پٹائی ہوئی اور میں بستر کے نیچے چھپ گیا۔

ایک دن کوڑے کے ڈبے کو کریدتے ہوئے مجھے پانچ شلنگ کا ایک نوٹ ملا۔ میں نے سعید سے کہا کہ مجھے یہ نوٹ ان لوگوں کے پاس لے جانا چاہیے جن کے کوڑے کا یہ ڈبا ہے۔

'بے وقوف مت بنو' وہ بولا 'یہ تمھیں ملا ہے۔'

'لیکن یہ غلط بات ہے' میں نے کہا 'یہ ہمارا تو نہیں۔'

'کون کہتا ہے؟'

'ابا'

اس نے جواب میں ایک حقارت بھری آواز نکالی

'لیکن یہ تو چوری ہوئی' میں نے اصرار کیا۔

'تم کتنے احمق ہو' وہ سرد مہری سے بولا۔ اس کی آواز میں افسردگی تھی۔ وہ پلٹ کے جانے لگا۔ میں پانچ شلنگ کا نوٹ لیے اس کے پیچھے دوڑا۔ ہم دونوں نے دو، دو آئس کریم خریدیں، بھجیا، آلو اور چاکلیٹ۔ ہم پارک میں بیٹھ گئے۔ وہ اس زمانے میں جوبلی پارک کہلاتا تھا۔ وہاں ایک گھنے درخت کے سائے میں پکنک منائی۔ ہم نے پلاسٹک کی ایک فٹ بال خریدی اور پارک واپس جا کر دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلتے رہے۔ ہم گھر یوں لوٹے کہ فٹ

بال میرے بغل میں تھی اور دو چاکلیٹیں سعید کے ہاتھ میں۔ سعید نے کہا کہ ہم فٹ بال کی بوری میں چھپا دیں گے اور پھر دو تین دن میں اچانک دریافت کریں گے۔ جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ سعید نے فٹ بال مجھ سے لی اور خالی بوریوں کی جانب بڑھا۔

'کیا کر رہے ہو؟' میرے والد نے چیخ کر پوچھا، وہ دروازے پر کھڑے تھے۔

وہ بوری کی سمت گئے اور گیند باہر نکالی۔ انھیں یقین تھا کہ ہم نے گلیوں میں بھیک مانگ کر پیسا جمع کیا ہے، یا شاید کوئی اس سے بھی ذلیل کام۔ میں نے بتایا کہ مجھے پیسے پڑے ملے تھے تو وہ ناراض ہو گئے۔ کہنے لگے تم میری ذہانت کا امتحان لے رہے ہو، تمھارے خیال میں، میں اپنا دماغ گوبر میں رکھتا ہوں۔ سعید نے مجھے گھور کے دیکھا، جیسے تنبیہ کر رہا ہو کہ خاموشی سے مار کھالو، کچھ بولو نہیں۔ میں نے انھیں پھر بتایا کہ ہمیں پیسے کوڑے کے ڈبے میں ملے تھے۔ سعید نے آسمان کی سمت بھنویں اچکائیں۔ سب پر ایک خاموشی چھا گئی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے کہ جو اس حیرت زدگی کی باعث ہے۔

'اچھا' والد اس کی جانب مڑے 'تو پیسے کوڑے کے ڈبے میں پڑے ملے تھے؟'

میں والد کو غصے سے پھولتا دیکھ رہا تھا، ان کی آنکھیں ابل رہی تھیں۔ سعید نے سسکنا شروع کر دیا۔

'کون سا کوڑے کا ڈبا؟' میری ماں نے میرے والد اور سعید کے درمیان آتے ہوئے مداخلت کی۔ 'کیا کر رہے تھے تم لوگ، اچھا ہوا تمھیں کوئی بیماری نہیں لگ گئی، کیا تلاش کر رہے تھے تم لوگ؟'

انھوں نے سعید کا کالر پکڑا اور اسے گھسیٹ کر لے جانے لگیں۔ میرے والد آگے بڑھے اور دھکا دے کر انھیں ایک طرف کر دیا۔ سعید جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میری ماں آہستگی سے سسکنے لگیں ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

'میں جانتا ہوں یہ کوڑے کے ڈبے میں کیا ڈھونڈ رہا تھا' میرے والد سعید کی جانب بڑھتے ہوئے بولے 'یہ کوڑے دان میں وہ تلاش کرتا ہے جو اسے گھر میں نصیب نہیں۔ اور جب

اسے وہاں بھی نہیں ملے تو پھر یہ کسی کے بستر میں تلاش کرتا ہے، جفتی کھیل کر، چھوٹے حرامی!'
میں بتانا چاہتا تھا کہ یہ سعید نہیں بلکہ میں تھا۔ لیکن میں بہت خوف زدہ تھا۔ سعید نے سسکنا بند کر دیا تھا اور پوری توجہ والد پر مرکوز کر دی تھی، وہ بھاگ نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ میری ماں اب با آواز رو رہی تھی، ان کا جسم ایسے ہل رہا تھا جیسے عبادت کر رہی ہوں۔
'میں نے تمھیں کہا تھا' میرے والد اس کی جانب جھکتے ہوئے بولے 'میں نے کہا تھا کہ ایسی حرکت پر میں تمھاری گردن توڑ دوں گا۔'

سعید مڑ کر بھاگا تو میرے والد نے اس کے شانے پر ایک گھونسا مارا۔ ایسے لگا جیسے گوشت پر کلہاڑی چل گئی ہو۔ سعید کے گھٹنوں نے جواب دے دیا، اس کا منہ ایسے کھل گیا جیسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔ میرے والد نے قدم آگے بڑھائے، اب وہ اپنی اولادِ نرینہ سے چند انچوں کے فاصلے پر تھے۔ انھوں نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ سعید نے اٹھنے کی کوشش کی تو انھوں نے پھر لات ماری۔ انھوں نے اس پر مکے برسائے، اس کے جسم پر اپنا سر مارتے رہے، اور اس کی کلائی پر کاٹ لیا۔ وہ اسے اس وقت تک مارتے رہے کہ اس کا پاخانہ خارج ہو گیا۔

'چھوڑ دو اسے' میری ماں چلا کر میرے باپ سے لپٹ گئی 'جان سے مار دو گے اسے!'
انھوں نے ماں کو دھکا دے کر گرا دیا، وہ ان کی جانب مڑے اور کسی جانور کی مانند غرائے۔ وہ غصے سے ہوا میں ہاتھ چلا رہے تھے۔ میری ماں زمین پر گری ہوئی تھی۔ وہ سعید کی جانب مڑے اور چیختے ہوئے پھر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے اسے حقیقی نفرت اور غصے کا نشانہ بنایا۔ ان کے بازوؤں سے پسینہ بہہ کر ان کے چہرے کو تر کر رہا تھا۔ آخر وہ اس کے اوپر کھڑے ہوئے، پاؤں دونوں جانب پھیلے ہوئے تھے، اور چیخے 'کافی ہے اتنا تمھارے لیے؟'
وہ اپنی اولادِ نرینہ پر کھڑے ہوئے چیخ رہے تھے 'اتنا کافی ہے تمھارے لیے؟'
میری ماں نے مجھے الزام دیا، مجھے معلوم ہے انھوں نے 'مجھے ملزم گردانا۔ سعید کسی چھوٹے سے جانور کی مانند تڑپ رہا تھا اور بلک رہا تھا۔ ماں نے اسے نہلایا اور اس کی حالت پر روتی رہیں۔ انھوں نے اسے لوری سنائی اور تھپک کر بستر پر لٹا دیا۔ اس شام اسے سب سے پہلے میں

نے ہی دیکھا تھا۔ میری ماں نے اس کے بستر کے نزدیک ایک شمع روشن کر دی تھی۔ جب میں اندر گیا تو اس کی قمیض میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک ہی کپڑوں اور اخبارات کا ایک ڈھیر بھی آتش زدہ تھا۔ وہ زمین پر گرا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مدہوش سا اپنے سینے کو کوٹ رہا تھا۔ میں نے چیخ کر اسے آواز دی تو وہ میری جانب مڑا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا

'اسے بجھاؤ، اسے بجھاؤ' وہ چیخا

وہ اپنی پوری جان سے چلایا، ہیبت نے اس میں طاقت بھر دی تھی، وہ چادروں پر لوٹ رہا تھا، وہ اٹھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ میں بھاگ کے روتا چلاتا نزدیک گیا اور آگ بجھانے کی کوشش کرنے لگا لیکن محض اپنے ہاتھ جلانے میں ہی کامیاب ہوا۔

'او، اللہ اللہ' وہ چیخ رہا تھا

میں نے اس سے التجا کی کہ آگ بجھائے۔ میں کھڑا اسے جلتا دیکھتا رہا، اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ فرش پر گرا اس کا چہرا غصے سے مسخ ہو گیا تھا۔ وہ الٹ گیا، اس کی ٹانگیں چلنے لگیں، بستر کا فریم اس پر گر پڑا، اور وہ جلتا رہا۔ اس کے پیر ایسے تھے جیسے رانوں کی مشعلیں بن گئی ہوں۔ اس کے چہرے پر سفیدی نکل آئی تھی اور وہ غیر مانوس ہو گیا تھا۔ آگ اس کی رانوں کے اوپر کے حصے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے سینے سے آگ کے شعلے اٹھ رہے تھے۔

سب سے پہلے میری ماں داخل ہوئیں، وہ دروازے پر ہی ٹھٹک گئیں اور ان کا ہاتھ منہ تک بلند ہو گیا۔ ان کے اندر سے ابھرتی ہوئی چیخ انگلیوں کو چیرتی باہر نکلی۔۔ وہ بھاگ کر آگ کو اپنے ہاتھوں سے بجھانے لگیں، جو بھی ان کے ہاتھ لگا اس سے آگ بجھانے لگیں۔ مجھے یاد نہیں کون، لیکن کوئی پانی کی بالٹی لیے دوڑا آیا۔ وہ مر چکا تھا۔ میں اس وقت پانچ برس کا تھا۔ اب کمرا لوگوں سے بھر چکا تھا جو دعائیں پڑھ رہے تھے اور گریہ کناں تھے۔ کمرے میں ہر طرف پانی تھا، اس پر جلے کاغذ کے ٹکڑے بہہ رہے تھے۔ میری ماں کسی کے بازوؤں میں پاگلوں کی طرح بین کر رہی تھیں۔ انھوں نے مڑ کر میری جانب اشارہ کیا، وہ ایسے چیخ رہی تھیں کہ میں سمجھ نہ سکا کہ انھوں نے کیا کہا۔

انھوں نے مجھے الزام کیوں دیا۔ میں نے تو اسے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی۔ ان

سب نے ہی اسے مارا تھا، میں تو پانچ برس کا تھا۔ وہ میرا دوست تھا، میرا بھائی۔ وہ میرا واحد دوست تھا اور میرا اکلوتا بھائی۔ وہ مجھے کیوں الزام دے رہے تھے۔

قبر پر کھڑے ہوکر پہلے کسی نے تلاوت کی، پھر ہدایات پڑھیں کہ قبر میں مردے کو کیا کرنا چاہیے۔ انھوں نے سعید کو یاد دلایا کہ جب فرشتے آکر سوال کریں تو اسے کیا جواب دینے ہیں؛

'اور جب وہ تم سے تمھارا نام پوچھیں، تو کہنا میں خدا کی مخلوق ہوں، سعید بن عمر۔۔۔'

سعید نے جتنے غلط کام کیے تھے وہ ان کی لمبی سزا پائے گا۔ وہ تمام ننھی مقعدیں جن سے اس نے جنفتی کھیلی، فرشتے سرخ تپتی ہوئی زنجیریں اس کے منہ میں ڈال کر اس کی مقعد سے نکالیں گے، یہی خدا کی طرف سے سزا ہے۔

میرے والد نے پیسے دے کر مقامی مسجد میں ختم کرایا۔ لگتا تھا کہ سیکڑوں لوگ سعید کی قرآن خوانی میں جمع ہو گئے تھے۔ دعائیں پڑھی گئیں اور داغِ مفارقت دے کر جانے والے اس عزیز کی خوبیاں بیان کی گئیں۔ پیشہ ور کارکنوں نے حلوہ بانٹا تاکہ مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی چند ندیدے سب چٹ نہ کر جائیں۔ اس سے پہلے میرا کوئی قریبی عزیز نہیں مرا تھا۔ لوگ آکر مجھ سے ہاتھ ملاتے اور افسوس کا اظہار کرتے۔ اس سے مجھے سعید پر فخر محسوس ہونے لگا۔

سعید کی روح مہینوں ہمارے درمیان زندہ رہی۔ اب ہمیں بلند آواز سے گانے یا اکثر لڑنے کی اجازت نہیں تھی۔ میرے والد کی نمازیں لمبی ہونے لگیں، ان کے شانے جھک گئے۔ ہمیں فلم دیکھنے، شادی بیاہ میں شرکت یا ناچ گانے کی ممانعت ہوگئی تھی۔ میری ماں شاید ہی کسی سے ہم کلام ہوئی ہو۔ میری دادی ٹینگا (Tanga) کچھ عزیزوں سے ملنے چلی گئی۔ میرے والد اکثر میری پٹائی کرتے تھے۔ مجھے ان سے ایسا خوف آنے لگا کہ میں ان سے بات کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اب وہ اور زیادہ راتیں گھر سے باہر گزارنے لگے۔

میرے والد اپنی جوانی میں بہت منہ زور تھے۔ جب وہ رات میں گھر آتے تو ان کی چھڑی پر خون اور بال چپکے ہوتے، لیکن ان کے جسم پر کہیں کوئی نشان نہ ہوتا۔ وہ اس زمانے کے مرد تھے، ایسی مردانگی کہ جس کی مردوں سے توقع کی جاتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ اس

زمانے میں کسی کتے کی مانند تھے۔ جو واقعتاً ان کے لیے ایسی توہین آمیز بات نہیں ہے۔ میری پیدائش سے پہلے کی ایک تصویر میں، وہ اسٹوڈیو کے کھجور درختوں، اور ساحل کے تصویری پردے کے سامنے کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھیں نکلی پڑ رہی ہیں، جیسے کسی حیوانی بد دماغی سے کیمرے کا سامنا کر رہے ہوں۔ ان کی چھڑی ان کی دائیں ران سے ٹیک لگائے کھڑی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے ان پر ایک بے قابو غصے کا دورہ پڑنے والا ہے۔

یہ تصویر مجھے والدہ نے دکھائی تھی، میں خاموشی سے ان کے کچھ کہنے کا منتظر رہا۔ انھوں نے بنا کوئی لفظ کہے وہ تصویر واپس رکھ دی، میری جانب دیکھا تک نہیں۔ میں غصے سے ابلتی ان آنکھوں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ جواب شراب سے مخمور رہتی ہیں۔ میں پوچھنا چاہتا تھا۔ میں ہمیشہ والدہ سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ ایسے کیوں ہیں۔ وہ اتنے ناخوش کیوں ہیں؟ ان کے بارے میں جو باتیں مشہور ہیں، کیا وہ سچ ہیں؟ کیا یہ سچ ہے کہ وہ سیاہ فام چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے انھیں ثور کے عربوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے تھے۔ یہ میں نے اسکول میں سنا تھا۔ کیا یہ سچ ہے کہ ایک بچے کی مقعد پھاڑ دینے کی وجہ سے انھیں جیل بھیج دیا گیا تھا؟

مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ باتیں سچ ہیں۔ لیکن ان کے غصے کے یہ دورے سچ تھے۔ اس قدر شدید اور تباہ کن کہ لگتا تھا وہ ہر قسم کی بے رحمی پر قادر ہیں۔ ان کے ہونٹ سیاہ تھے، ان میں دراڑیں پڑ گئی تھیں، جو خشک گرمی میں کبھی خون رسنے لگتیں۔ وہ اپنے قد سے زیادہ لمبے نظر آتے۔ ان کے بازو موٹے، عضلات سے بھرپور تھے۔ ان کے تراشیدہ بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ سعید بڑا ہو کر بالکل ان کا عکس ہوتا اور میرے والد اسے فخر سے دیکھتے۔ وہ مجھے ہمیشہ عزت و فرماں برداری پر اکساتے۔ جب کہ میں نے کبھی زندگی میں ان کی بات نہ ماننے یا نافرمانی کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ کچھ ایسے جذبے سے اذیت پہنچاتے کہ اکثر تو میں محض ان کی موجودگی سے ہی رونے لگتا۔

ایک بار جب میں بیمار تھا تو میری والدہ نے میرا بستر اپنے ساتھ فرش پر ہی بچھا دیا، کہ مبادا مجھے رات میں کسی شے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ مجھے اپنی بیماری پر پیار آ گیا اور ان کے اتنے نزدیک ہونے پر فخر محسوس ہوا کہ زیادہ تر وہ مجھے اپنے اتنے نزدیک ہونے نہیں دیتی

تھیں۔ وہ میرا خیال تو رکھتیں، مجھے کھانا کھلاتیں، میرے بالوں سے جوئیں نکالتیں، لیکن مجھے نزدیک نہیں آنے دیتی تھیں۔ اور میں بھی وہ نہیں بھول سکتا کہ جب انھوں نے اپنے زیاں پر گریہ کیا تھا اور ان کی انگلی میری سمت میں اٹھی ہوئی تھی۔ لیکن اس رات انھوں نے مجھے تھپتھپایا اور ایک عجیب شیریں محلول پلایا جو بقول ان کے میرے لیے مفید تھا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میرے والد ان کے بستر پر جھکے ہوئے تھے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ لالٹین جسے رات بھر روشنی کی خاطر برآمدے میں جلتا چھوڑ دیا گیا تھا، اس سے کمرے کے کچھ حصے روشن تھے۔ میں انھیں صاف نہیں دیکھ سکتا تھا اور کاش بالکل نہ دیکھا ہوتا۔ بستر دروازے کے سائے کی تاریکی میں تھا۔ ان کے پاس سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ اپنی شراب نوشی پر شرمندہ تھے اور اسے ہم سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے۔ میں نے دیکھا تو وہ ماں کی کلائی پکڑے ان سے سرگوشی کر رہے تھے۔ یہ میں نے پہلی بار انھیں ماں کو یوں چھوتے دیکھا تھا۔ وہ اچانک سیدھے ہوئے اور پھر آگے جھک کر ماں کے منہ پر طمانچہ مارا، وہ پھر سرگوشیاں کرنے لگے اس بار ذرا بلند آواز سے:

'تم مجھے ہٹا رہی ہو، صرف اس کی وجہ سے۔ یہ کس کام کا ہے؟ او میری ماں کیوں مجھے غصہ دلا رہی ہے؟' میری والدہ نے انھیں چپ کرانے کی کوشش کی۔ اور میں نے ان کا ہاتھ والد کے منہ کی طرف بلند ہوتے دیکھا۔ انھوں نے والدہ کا ہاتھ جھٹک دیا اور سیدھے کھڑے ہو گئے۔

'تم اسے یہاں لائی ہی کیوں تھیں؟' انھوں نے اجنبی سے لہجے میں دریافت کیا کہ جیسے گڑگڑا رہے ہوں 'تم مجھے دور کر رہی ہو؟ اس چھوٹے، گندے قاتل کی خاطر۔ تو سمجھتی کیا ہے منہ بسورتی کتیا؟'۔

انھوں نے انھیں مارا، پھر دوبارہ مارا، با آواز غراتے ہوئے، اور ایک بار پھر مارا۔ وہ کسی طرح بستر میں گھس گئے اور جوتہ بند ماں نے اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی وہ علیٰحدہ کر دی۔ میری ماں نہ کچھ بولی نہ انھوں نے کوئی جدوجہد کی۔ کبھی کبھی ان کے منہ سے ایک غیر ارادی کراہ نکل جاتی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے ان کا جسم ماں کے جسم پر رگڑنے کی آواز آ رہی تھی۔

میں انھیں غراتے، بڑبڑاتے سنتا رہا۔ بستر سے ان کی گھٹی ہوئی آواز آرہی تھی۔ میری دادی کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ میرے والد نے توقف کیا، سر اٹھا کے دیکھا کہ کیا وہ اس طرف آرہی ہیں، پھر دبی زبان سے ہنسے۔

'آؤ دیکھو بوڑھی عورت' انھوں نے آواز دی 'دیکھو میں کیسے اسے قتل کر رہا ہوں۔'

وہ پھر شروع ہو گئے، سرگوشیاں، بڑبڑاہٹ، جفتی، کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی۔ میں نے سنا وہ سسکیاں لے رہے تھے۔ مجھے ان کے اٹھنے کی آواز سنائی دی اور پھر میں نے اپنے آنسوؤں کی اوٹ سے انھیں اپنے اوپر جھکے ہوئے پایا۔ 'باہر نکلو'، وہ بولے۔ میں گڑبڑا کر گھٹنوں کے بل کمرے سے نکل گیا۔ دادی باہر برآمدے میں کھڑی تھیں۔ میں ان کی جانب گھسٹنے لگا۔ میں بخار سے بہت نقاہت اور کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ وہ آہستہ سے مڑیں اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ وہ رات میں نے اسی طرح اپنی دادی کے دروازے کے سامنے سمٹے ہوئے بسر کی۔

مجھے اس دنیا سے خوف اور نفرت محسوس ہوئی جس میں انھوں نے مجھے پیدا کیا تھا۔

میری ماں اس کے بعد مجھ سے اور زیادہ چھپنے لگیں، لیکن میں ان کا تعاقب کرتا، ان کا منتظر رہتا۔ کبھی ان کی اچٹتی ہوئی نگاہ مجھ پر پڑتی تو مجھے اس میں شرم کی جھلک نظر آتی۔ میرا دل ان کے لیے رو دیتا۔ لیکن پھر بھی میں وہ منظر نہیں بھول سکا کہ کیسے انھوں نے الزام کی انگلی میری جانب بلند کی تھی۔

میں نے پشتے سے لہروں کو لوٹتے دیکھا اور لہروں کی پتھروں سے سر مارنے کی آواز سنتا رہا۔

سمندر کے کنارے میرے یہ شکوک وشبہات جیسے مزید رقت انگیز ہو رہے تھے۔ جب اوپر خدا اپنے جہنم، اپنی جنت اور بے شمار عذابوں کے ساتھ منتظر ہے، تو پھر دنیا اتنی مشکل کیسے ہو سکتی ہے؟

میں عورت کو چھونے کے شیطانی خیالات دل میں لائے بغیر ہی ایک مرد بن چکا تھا۔ موت کی یہ گفتگو جب کہ ابھی تو زندگی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ خدا نے مشت

زنی کو گناہ قرار دیا ہے، کہ اس سے آلۂ تناسل سکڑ جائے گا، اور سارا مادہ منویہ ضائع ہو جائے گا، بعد میں حمل ٹھہرانے کے قابل بھی نہیں رہو گے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے کہا تھا ’تم بہت مشت زنی کرتے ہو، نہیں؟‘ میں اسے سینے پر دباؤ کی شکایت کی وجہ سے دکھانے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ سائیکولوجی بھی پڑھ چکا ہے، اور اس نے وہیں میرا تجزیہ کرنے کی پیشکش کی۔

’یہ تمھارے لیے اچھا نہیں ہے‘ وہ بولا تھا ’اس سے تمھاری ساری قوت جاتی رہے گی۔ یہ تمھاری ہڈیوں کو کم زور کر دے گا۔ سن لو، ممکن ہے یہ بات تمھیں بے وزن لگ رہی ہو۔ میں تمھیں کچھ گولیاں بھی دوں گا۔ اپنی ماں سے کہنا تمھیں بہت سارا گوشت کھانے میں اور دودھ پینے کے واسطے دیا کریں۔‘

اور دوپہر کی گرمی سے بچانے کے لیے شتر مرغ کے پروں کی چھتری لا دے؟۔ میں نے اپنے خون سے اپنے ساتھ ایک معاہدہ تحریر کیا۔ لیکن خدا نے لڑکیوں کو حسین پیدا کیا اور ان کے جسم میں ایک تیکھی بو رکھی۔ میں اس کے بعد سر سے پاؤں تک غسل کرتا۔ دوسرے لڑکے تو کبھی نہانے کی زحمت بھی نہ کرتے۔ ان کے سینوں میں درد بھی نہیں ہوتا ہوگا۔

میں کتابیں اٹھا کر گھر کی جانب چل دیا۔ میرے پیچھے ساحل سورج کی تمازت میں خشک ہو رہا تھا۔ اس میں بسی صدیوں کی باس نکل رہی تھی۔ گئے دنوں میں جو غلام تبدیل ہونے سے انکار کرتے وہ تو ساحل مرنے کے لیے ہی آتے تھے۔ وہ تختوں اور مردہ پتوں پر تیرتے، جنگ کے مارے۔ ان کی سیاہ جلد پر زمانے کی جھریاں اور دل ٹوٹے ہوئے تھے۔ میرے مجبور باپ، دادا، مائیں، نانیاں ایک پتھریلی دیوار میں حلقۂ زنجیر سے قید کیے گئے تھے۔

میں بڑی شاہراہوں سے بچتا، مانوس سڑکوں اور گلیوں میں چلتا رہا۔ چند مکانوں کے درمیان خالی جگہ میں، میں نے دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی اکڑوں بیٹھا اپنے خارش زدہ فوطوں سے پپڑیاں کرید رہا تھا، ساتھ ہی فضلے کا ایک ادھا خارج کرنے کے لیے زور لگا رہا تھا اس نے مڑ کے اپنی محنت کے نتیجے پر نظر ڈالی۔ تعویذ کا دھاگا اس کی گردن کے ڈھیلے عضلات میں گڑ رہا تھا، مجھے دیکھا تو وہ ہنس پڑا۔ اس نے زور لگا کے بدبودار ہوا خارج کی، سورج کی حدت سے اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ وہ اٹھا، اسے سیدھا ہونے میں تکلیف ہو رہی تھی، اور

قریبی دیوار پر پیشاب کرنے مڑ گیا۔ یہودی آفس کے نزدیک میں بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گیا تاکہ پیشاب کی سڑاند میں سانس نہ لینی پڑے۔ میں نے بڑی شاہ راہ عبور کی جو دوپہر کی گرمی کی وجہ سے خالی تھی، اور پبلک حمام والی گلی میں مڑ گیا۔ بند نالیوں اور کائی کی تیز بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ موڑ پر ایک بوڑھا اپنے پھلوں اور سبزیوں کی دکان کے گلک پر اونگھ رہا تھا۔ گلے، سڑے پھل فرش پر پڑے تھے۔ ہر سمت میں میٹھے آم کے رس سے ٹائروں کے گیلے نشان بن گئے تھے۔

'یہاں رہے تو تم ایک گوبھی میں تبدیل ہو جاؤ گے۔'

یہ بات میرے استاد نے اس وقت کہی تھی جب میں اپنے اسکول کے سالانہ کھیلوں کے فاتحین کے نام درج کرنے میں مدد کر رہا تھا۔ جیتنے والوں کے سرخ کارڈ، دوئم آنے والوں کے نیلے اور تیسرے نمبر والوں کے سبز کارڈ۔ گوبھی ہی کیوں؟ وہ انگلستان سے پڑھ کر آیا تھا اور واپس آ کر اس نے مذہب کو انتہائی شدت سے اوڑھ لیا تھا۔ 'تم اپنی زندگی میں کیا کرنا چاہتے ہو؟ ۔ چلے جاؤ، اپنی زندگی کو کسی کام میں لاؤ۔ انگلستان چلے جاؤ۔ لامذہب ہے لیکن وہاں بہت امکانات ہیں۔ تم کیا بننا چاہتے ہو، ڈاکٹر؟'

کیا یہ اتنا غیر ممکن تھا؟ تنہائی کے لمحات میں اپنے آپ کو انگلستان میں ایک ڈاکٹر تصور کرتا۔ ایک طویل برآمدے میں سفید کوٹ پہنے، کالے فریم کی عینک۔ گریگوری پیک کا عکس۔ میری ساری خواتین مریضائیں ہیں اور ان سب کو منہ در منہ سانس دے کر جان بچانے کی ضرورت ہے۔

'اگر تم یہاں رکے تو تمھارے کیا امکانات ہیں؟' میرے استاد نے پوچھا تھا 'زیادہ سے زیادہ یہ کرو گے کہ کسی بنک میں نوکری کر لو گے، یا کہیں ٹیچر بن جاؤ گے۔ یا تمھارے کوئی طاقت ور رشتہ دار ہیں، جنھیں میں نہیں جانتا؟'

''بنک کلرک بننے میں کیا بے عزتی ہے، رزقِ حلال ہے۔ لیکن اس وقت ملک کو ان کی ضرورت نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر، انجینیر اور گریجوٹ درکار ہیں۔ ہمیں فلسفی اور قصہ گو نہیں چاہییں،

بلکہ جنگلات دان، سائنسدان اور جانوروں کے ڈاکٹروں کی ضرورت ہے۔ کلچر امراء کا شوق ہے۔ کلچر تو انحطاط پذیر ہوتا ہے۔ روم کو دیکھو، فارس کو دیکھو، بغداد یا قاہرہ کو دیکھو۔ کلچر نے انھیں بربادی کے سوا کیا دیا ہے؟'

وہ ہمیں انگریزی ادب پڑھاتا تھا اور اکثر جوشِ خطابت کا رخ یورپین تکبر کی تباہ کن لاعلمی کی سمت پھر جاتا۔ کیمیا، الجبرا، فلکیات یہ سارے علوم مسلمانوں نے ہی پس ماندہ یورپ کو سکھائے تھے۔ لیکن پھر مسلمان صحرا کا نظم و ضبط بھول گئے۔ انھیں ضیافتوں، میلوں اور عیش کی عادت پڑ گئی۔ دشمن جلد ہی ان پر غالب آ گیا، کیوں کہ اپنے دورِ وحشت میں بھی وہ کلچر کی انحطاط پسندی سے واقف تھا۔ لہٰذا تم یہ شیکسپیر پر دماغ مت ضائع کرو۔ بہت سے لوگ تو کہتے ہیں کہ اس کا وجود تو تھا ہی نہیں۔ اور اگر تھا بھی تو وہ مشرق کا کوئی ولی تھا، جس کا کام انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے۔ تمھیں تو پتا ہی ہے یہ یورپین کیسے ہوتے ہیں۔ وہ جین آسٹن میرے خیال میں انگریز تھی، تمھارا کیا خیال ہے۔ وہ اونچی ناک اور چھوٹے ذہن والی مغرور عورت۔'

لیکن یہ تب کی بات ہے جب برطانوی ہم پر حاکم تھے۔ اور ہمارا استاد اپنی گھبراہٹ چھپانے کے لیے بھاگ کر دروازے سے باہر جھانکتا، کہ وہ ویلش جو ہمارا ہیڈ ماسٹر تھا کہیں برآمدے میں اسی طرف تو نہیں آ رہا۔ پھر وہ واپس آ کر اپنا خطبہ شروع کر دیتا۔ بے چارہ ہمارا استاد۔ اس وقت کسے خبر تھی کہ اس کے دن گنے جا چکے ہیں۔ برطانوی جانے والے تھے اور انتقام کا دن قریب آ رہا تھا۔

جب میرے باپ سے شادی ہوئی اس وقت میری ماں کی عمر سولہ برس تھی۔ ان کے والد ایک لاری ڈرائیور تھے۔ ان کی یوگنڈا کے ایک چھوٹے سے گاؤں جنجا میں ایک دکان بھی تھی۔ میرے والد اس وقت بیس برس کے تھے اور اپنی غنڈہ گردی کے لیے مشہور ہو چکے تھے۔ میری دادی کا خیال تھا کہ ایک عورت ہی ان کی مقعدوں سے دل چسپی ختم کرا سکتی ہے۔ ہاتھی دانت کا ایک تاجر جو ملک کے اندرونی حصوں میں اکثر چکر لگاتا تھا، اس کی بیوی نے میری دادی کو ایک ایسی لڑکی کے بارے میں بتایا جو الف لیلوی حسن کی مالک تھی۔ ایک خوب صورت، سادہ، دیہاتی لڑکی کا خیال میری دادی کے دل کو بھا گیا۔ کئی بار میری ماں کے حسن کے گیت

گانے کے بعد اور سوچ بچار، معنی خیز نظروں کے تبادلے کے بعد، دونوں عورتوں نے اپنا منصوبہ تیار کر لیا۔

یہ خیال فوری طور پر تو میرے والد کو پسند نہیں آیا۔ انھیں اس کی کوئی ضرورت نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن آخر میں انھوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔، نہ ہی لڑکی کے باپ نے۔ حال آں کہ اسے معلوم تھا کہ میرے والد ایک بے پیندے کے غنڈے ہیں۔ انھیں ڈر تھا کہ اگر ایک طویل عرصے تک کنواری رہی تو میری ماں اندرونِ ملک کے کسی سیاہ فام کے عشق میں گرفتار نہ ہو جائے۔ مری ماں کی مرضی کسی نے معلوم نہ کی۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک خوش شکل آدمی کی منکوحہ پایا، اور اس کے عشق میں گرفتار ہو گئیں۔ وہ ایک دھیمی طبیعت، معصوم دیہاتی لڑکی تھیں۔ جب وہ اپنی شادی کے لیے دیہاتی علاقوں میں گئیں تو یہ ان کا گھر سے نکلنے کا پہلا موقع تھا۔

میرے والد ابتدا سے ہی بے وفا تھے۔ وہ ان کی بے وفائی سے واقف تھیں۔ وہ جب گھر ان کے پاس واپس لوٹتے تو وہ بے وفائی ان کے جسم پر سونگھ سکتی تھیں۔ شروع میں وہ روئیں، پھر اسے دنیا کا دستور سمجھ کے قبول کر لیا، اپنی شرم ساری اپنی ذات میں مقید کر لی۔ پھر ان کی مظلوم خاموشی کے جرم میں والد نے انھیں پیٹنا شروع کر دیا۔ میری دادی نے والدہ کو سمجھایا کہ شادیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، لیکن آخر میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔

پھر وہ ہم پر بھی تشدد کرنے لگے۔ اس لمحے وہ بہت بے رونق نظر آتیں، لیکن ہماری موجودگی میں انھیں للکارنے سے گریز کرتیں۔ انھوں نے ہمارے زخموں پر مرہم رکھنے، کراہنے، لوریاں سنانے اور تھپکیاں دینے کے سوا اور کچھ نہ کیا۔ انھوں نے ہمیں ان سے نفرت کرنا بھی نہیں سکھائی۔ نفرت ہوتی تو ہم زیادہ بہتر طور پر تیار ہوتے۔

جب میں مسجد جانے سے انکار کرتا تو وہ مجھ پر تشدد کرتے، کہتے میں اپنے خالق سے مکر گیا ہوں۔ انھوں نے جوتا اٹھا کر میری سمت پھینکا

'جاؤ، دفع ہو، مؤذن نے اذان دے دی ہے' وہ کہتے

دوپہر کی واماندگی اور آم کے درخت کے افسردہ سائے میں ان کی آواز اڑتی پھرتی۔ میں دروازے کے باہر کھڑا اپنی بے راہ روی کے بارے میں ان کے شکوے سنتا۔

'ایسے بچوں کا کیا حشر ہوتا ہے، چودہ برس کے ہیں اور ابھی سے خدا سے تنگ آچکے ہیں۔ یہ نماز پڑھتا تھا، درس میں جاتا تھا اور اچھی کتابیں پڑھتا تھا۔ امام موسیٰ نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ پیدائشی عالم ہے، اور اب ذرا اسے دیکھو۔'

امام موسیٰ کو یہ کسی نے نہیں بتایا تھا لیکن بارہ برس کی عمر میں، میں باقاعدگی سے مشت زنی کرنے لگا تھا۔ خدا نے مجھے ہاتھ کی ہر جنبش کی سزا دی۔ آخر میں نے خدا کو ترک کر دیا۔ اور اب ان بڈھے، مکار عالموں کی باتیں سننا بھی بند کر دیں جو کوئی نکتہ سمجھانے کے لیے ایک ہاتھ کی انگشتِ شہادت بلند کرتے تو دوسرے ہاتھ سے کسی چھوٹے بچے کی مقعد کو تلاش کرتے۔ اس کے بجائے میں نے فٹ بال کھیلنا شروع کر دیا۔ پتا نہیں ان سے کس نے کہا کہ میں باہر کھڑا ہوں کیوں کہ وہ کمرے سے ایسے باہر نکلے تھے جیسے انھیں وہاں میری موجودگی متوقع ہو۔ انھوں نے ایک لمحے مجھے گھور کے دیکھا، غصے سے ان کا چہرا سرخ ہو رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولا۔ میں مرجھا چکا تھا۔ ایک سوکھا برساتی نالا۔ ایک منہ مارتا ارنا بھینسا، کسی مستند شکاری کے لیے آسان شکار۔

'دفع ہو'ان کی آواز گہری اور ہموار تھی، لیکن چہرا غصے سے مسخ ہو گیا تھا 'مسجد جاؤ'

'چل پڑو'

یہ پچھلے ماہ کا ذکر ہے کہ جب تک وہ میرے اعمال کے ذمہ دار تھے، میرے مرد بننے سے پہلے کا۔ مجھے پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ چلا ہی کیوں نہ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو اترنے لگے۔ ہر پیشی پر ایسا ہی ہوتا تھا۔

'جاؤ' وہ چیخے اور میری جانب قدم بڑھایا۔

وہ میرے بہت نزدیک آ گئے۔ ان کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں، ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا، اور منہ کھلا ہوا تھا، یہ مجھے قتل کر دیں گے، میں نے سوچا۔

'کیا کہا تم نے؟' وہ اس زور سے چیخے جیسے پھیپھڑے ان کے جسم میں پھٹ گئے ہوں

'میں نے کہا ہے، نہیں' میں نے دہرایا

وہ حیرت زدہ نظر آئے۔ وہ سٹ پٹا سے گئے، میرے اور سعید کے ہاتھوں۔ انھوں نے

اپنا سر ہلایا۔ مجھ پر اور سعید پر وہ تمام تشدد، اور بے عزتیاں اور ان تمام سالوں کا خوف، بے اثر رہا؟

'گر تم نہیں گئے تو میں قسم کھاتا ہوں کہ تمھارے جسم کی ہر ہڈی توڑ دوں گا، واللہی، میں تمھیں مار ڈالوں گا' انھوں نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، اور آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا کی موجودگی کو گواہ بنا رہے ہوں۔'اب جاؤ'

'مجھے نہیں جانا' میں آہستگی سے ان سے دور ہوتا ہوا بولا

'جب تم یومِ حساب اپنے خالق سے ملو' وہ بولے'تو خدا تمھیں معاف کرے'

'میرا کوئی خالق نہیں' میں نے کہا

'خدا کے لیے۔۔۔' وہ کچھ خوف زدہ سے ہو گئے

'خدا کا کوئی وجود نہیں' میں نے کچھ بے باکی سے کہا

انھوں نے بغیر کچھ کہے مجھے مسکرا کے دیکھا۔ انھوں نے دروازہ بند کیا اور میری جانب بڑھ آئے۔ میں بلا حرکت کیے کھڑا رہا۔ وہ میرے منہ پر طمانچے مارنے لگے اور پوچھتے جاتے کہ خدا ہے یا نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ نہ روؤں، میں نے کوشش کی کہ نہ بھاگوں۔ ہر ضربت کے ساتھ ان کا غصہ بڑھ رہا تھا۔ میں خاموشی سے انھیں گالیاں اور کوسنے دیتا رہا۔ لیکن پھر درد میری برداشت سے زیادہ ہو گیا اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ وہ بے قابو ہو گئے اور جہاں ان کا ہاتھ پڑ سکتا تھا مجھے مارنے لگے۔ میں چیخا اور زور زور سے گریہ کرنے لگا۔ خدایا مجھے معاف کر، خداوند کہ جو خدائے واحد ہے، تمام مخلوقات کا خالق، مجھے بینائی دے، پہچاننے کی ہمّت دے۔ خدا کہ جس کا کوئی باپ، کوئی بیٹا نہیں۔ او خدا میرے حاکم میرے اوپر رحم کر کہ میں تیرے رحم کے قابل بھی نہیں۔

'خدا عظیم ہے' میرے والد مسرّت سے چلائے اور میری پسلیوں پر لات ماری۔

میری دادی کہا کرتیں کہ انھیں ہمیشہ اپنے دل میں یہ وہم ہوتا کہ میں جو اپنے خاندان کی محبت پر پرورش پاؤں گا، ایک دن اسی کے خلاف ہو جاؤں گا۔ وہ پر امید اور نیک نیت مسرّت سے جھومتی مجھے یاد دلاتیں کہ زندگی میں کیسی مصیبتیں میرا انتظار کر رہی ہیں۔ انھوں نے وہ

بیماریاں بتائیں جو ملحدوں کی آنکھوں اور آلاتِ جنسیہ کو لاحق ہوتیں۔ اب تم کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے مجھ سے دریافت کیا

میری ماں نے مجھ سے کہا کہ مجھے توبہ کرنی چاہیے اور اتنی کتابیں پڑھنے سے گریز کرنا چاہیے۔ انھوں نے بتایا کہ اگر میں نے خدا کو کھو دیا تو خطرات سے بھری اس دنیا میں تنہا رہ جاؤں گا۔ انھوں نے سمجھایا کہ خدا کو ڈھونڈو، دوبارہ کوشش کرو، توبہ کرو۔

گلیوں میں پھرتے ہوئے بھوک کی شدت کم ہوگئی تھی۔ میں گھر کی سڑک چھوڑ کر ندی کی سمت چل دیا۔ میں نے وہ پل عبور کیا جو ندی پر تعمیر تھا اور مڑ کے پانی کو سمندر میں اترتے دیکھنے لگا۔ دور سے وائرلیس کھمبے کا دھندلا، تاریک ہیولا نظر آ رہا تھا۔ سمندر اپنی وسعت میں بے کنار پھیلا ہوا تھا۔ درمیان میں کوئی پشتہ نہیں تھا جو اس منظر میں حائل ہوتا۔ میں آتی ہوئی موجوں کی سرمستی کو دیکھنے لگا۔ ان کی طاقت اور اس قوت کو جوان کا منبع تھی۔

ایک آدمی میرے پاس سے گزرا، پھر رک گیا، مڑا اور مجھے دیکھنے لگا۔ میرے اندر ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ مڑ کے آیا اور میرے برابر ہی کھڑا ہوگیا۔ پل پر جھک کر اس بے سمت دوپہر دور سمندر کو کھوجنے لگا۔ میں اپنے پہلو میں اس کے جسم کی موجودگی محسوس کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ میری مقعد کا طالب ہے۔ میں نے اس پر اچٹتی نگاہ ڈالی۔ اس نے بھی ترچھی نگاہ سے مجھے دیکھا تو ہماری نظریں مل گئیں۔ میں منڈیر پر سیدھا ہوا تو وہ بھی سیدھا ہو گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں خطرات منڈلا رہے تھے۔ میں نے کوشش کی کہ میرا اضطراب ظاہر نہ ہو۔ 'خوب صورت منظر ہے' وہ اپنی فتح پر مسکرایا۔ س کی گفتگو شرارت آمیز تھی۔ اس میں رومانوی اشارے تھے۔ وہ پھر سمندر کی جانب مڑ گیا 'بہت خوب صورت' وہ بولا۔ اس بار اس نے مجھے ایک بھرپور مسکراہٹ سے نوازا۔ اس کے دانتوں میں غذا کے ذرات اور تمباکو کے دھبے تھے۔ اس کی ٹھوڑی پر مہاسے، ہونٹ کے نیچے سے پھیل کر زخرے کے اوپر جلد کی سلوٹوں میں گم ہو گئے تھے۔ اس کے موٹے ہونٹ پپڑیوں سے ڈھکے تھے۔ اس کے بالوں میں اون، مٹی اور گھاس پھوس گندھے ہوئے تھے۔ اس کی موٹی گردن قمیض سے پھنس

کر نکل رہی تھی، جس کی بغلیں بدرنگ ہو چکی تھیں۔ وہ کسی ڈراؤنے خواب والا سادیت پسند، اوغام پرست، زانی تھا۔

'خوب صورت' یہ لفظ اس کے ہونٹوں میں طوالت کھینچ گیا، جب کہ اس کی آنکھیں میرے بدن کا طواف کرتی رہیں۔ شہوت کے اظہار میں اس کی زبان ہونٹوں کو چوم رہی تھی۔ وہ منتظر رہا۔ میری جانب مسکراتا رہا۔ پھر اچانک برا سا منہ بنا کے پیلے بلغم کا ایک ڈھیر پانی میں تھوک دیا۔ اپنے خشک گلے کو تر کرنے کی خاطر تیزی سے تھوک نگلنے لگا۔ اس نے میری سمت اپنی پیٹھ کرلی۔ اس کی آنکھیں مجھے جانچ رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے مسکرا کے انتظار کر رہا تھا۔

'کیا عمر ہے تمھاری؟' کچھ دیر بعد اس نے پوچھا

'میں نے شاید تمھیں اپنے والد کے ساتھ دیکھا ہے' میں نے جواب دیا

'میں نے کچھ کیا تو نہیں' وہ بولا 'تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'

میں اس کے ڈر جانے پر مسکرایا اور جانے لگا۔

'اگر تمھیں پیسوں کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مانگ لینا' اس نے آواز دی۔ میں نے اس کا قہقہہ سنا اور بہ مشکل اپنے آپ کو دوڑنے سے باز رکھا۔

میں ان شکاری پرندوں سے لڑتے لڑتے تھک گیا تھا۔ اسکول کے پہلے سال ایک ہم جماعت، عبّاس، مجھے روز ایک پینی دیتا۔ ایک تاریخی اغلام بازی کے لیے آمادہ کرنے۔ جس دن اسے دانتوں کے معائنے کے لیے جانا تھا اس دن بھی وہ خاص طور پر مجھے پینی دینے اسکول آیا۔ اس کا خاندان بہت امیر تھا اور کلاس کے سب غنڈے اس کے خدمت گار تھے۔ میں گویا اس کا کھلونا تھا، اس کا تنخواہ دار۔ کبھی تو وہ ساری صبح مجھے تکنے میں گزار دیتا۔ انگریزی، حساب، ماحولیات کی ساری کلاسوں کے دوران، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اساتذہ اور دوسرے طلبہ بے ہودہ مسکراہٹوں کے ساتھ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر میں اس کی جانب دیکھتا تو وہ آہستگی سے ہونٹوں پر زبان پھیر لیتا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن وہ مجھے چھونے کی کوشش کرے گا۔ دوسرے تمام لڑکوں کے سامنے مجھے شرم سار کرے گا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس نے ایسا کیا تو

میں ایک چھری اسکول لا کر اسے قتل کر دوں گا۔

میں اس کے پیسے کے لیے اس کا شکر گزار تھا۔ ترغیب کا دن آنے تک وہ مجھے ایک شلنگ روز دے رہا تھا۔ اب ہماری عمریں بھی بڑھ رہی تھیں۔ جس لمحے کے لیے ہم سالوں سے خوف زدہ تھے، اس سے ہم ہنس کر گزر گئے۔

مفروضہ یہ تھا کہ اگر آپ کم زور اور خاموش طبع ہیں تو آپ کو بہ زور کسی کونے میں گھسیٹ کر جفتی کھیلی جائے گی۔ اسکول کے اوّلین سالوں مجھے اکثر آرزومند عشاق سے لڑنا پڑا۔ ان لڑائیوں میں جیت ضروری نہیں تھی، اور میں جیتا بھی نہیں۔ اہم بات یہ تھی کہ آپ یہ واضح کر دیں کہ میزان چاہے کتنا ہی غیر متوازن ہو آپ لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ ان میں سے کئی لڑکوں کے لیے تو یہ محض ایک کھیل تھا، اپنی مردانگی اور رجولیت کے اظہار کا کھیل۔ اساتذہ اسے مسکرا کے ٹال دیتے۔ سعید کی مدد میرے کام آسکتی تھی۔

مجھے لگا کہ جیسے خدا نے مجھے کلنک کا ٹیکا لگا دیا ہے۔ جیسے وہ مجھے سعید کی حرکتوں کی سزا دے رہا ہے۔ مجھے لگا کہ اذیتوں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ میں نے گھر پر اس کا کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔ میں بہت خجل تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ میرے اندر ہی کوئی ایسی چیز ہے جو لڑکوں کو ان حرکتوں پر اکساتی ہے۔ پھر میں ایک لڑائی میں فتحیاب ہوا:

ایک روز اسکول سے گھر واپس لوٹتے ہوئے مجھے اپنا ایک اذیت کنندہ 'سعود' ملا۔ اس نے میرا تعاقب کر کے مجھے اپنی محبت کا یقین دلایا، اور جتایا کہ وہ میرے لیے خطیر رقم دینے کو تیار ہے، میرے خیال میں شاید تین شلنگ تھے۔ میں رک کر اس کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے نزدیک آ کر میرے رخسار پر ہاتھ پھیرا، اور پھر ایک، ایک کر کے اپنی انگلی چوم لی۔ سڑک کے کنارے چائے خانے میں بیٹھے لوفروں نے اس کی چومنے کی ہر ادا کی داد دی۔ سعود نے مڑ کے گویا ان کی داد کی رسید پیش کی۔ میں اس پر ٹوٹ پڑا۔ میرا گھونسا اس کے منہ پر پڑا، اور میں اس پر یوں سوار تھا کہ میرا گھٹنا اس کی رانوں کے جوڑ میں گڑا ہوا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس کے چہرے پر مکے برسانے لگا۔ اس کو مارتے مارتے میرے ہاتھ میں درد ہونے لگا۔ میرے ہاتھ کی پوروں کے جوڑ سے خون رسنے لگا۔ اس وقت تو مجھے زیادہ درد محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس

کے منہ اور ناک سے خون جاری تھا اور اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔ وہ کوشش کر کے میرے نیچے سے نکلا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

میں صرف اتنی دیر رکا کہ چائے خانے میں بیٹھے آوارہ گردوں کی طرف اپنا مکا بلند کر سکوں، پھر اس کے تعاقب میں دوڑ پڑا۔ میں سعود کے دوستوں کو اس کی مدد کے لیے لپکتا دیکھ رہا تھا۔ میں نے سعود کو زمین پر پٹخنی دی، اور اس کے دوستوں کے آنے سے پہلے بہ خوشی اس پر مزید چند مکے برسائے۔ اس نے مدافعت کی اور گھسٹ کر سبزی کے اسٹال کے نیچے گھس گیا۔ میں نے اس کے دوستوں کا انتظار کیا، انھیں للکارا کہ اپنے شکست خوردہ دوست کا بدلہ لیں۔

اس کے بعد ترغیبات کا سلسلہ بند ہوگیا۔ وہ لڑکے بھی مجھ سے رجوع کرنے لگے جو خود اغلام بازی میں مفعول بننا چاہتے تھے۔ اس ماحول کا نتیجہ یہ کہ آپ ہر مہربانی کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں، ہر اجنبی کی طرف سے مشکوک رہتے ہیں۔ پھر یا کسی نیک نیتی سے ادا ہوئے ستائشی کلمات کو سن کر چیختے ہوئے بھاگ نکلتے ہیں، یا کسی مدد کرنے والے ہاتھ کو غلط نام دیتے ہیں، اس طرح آپ اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں۔

ہمارے پڑوس میں ایک چکلہ تھا، جس میں دو مرد اور دو خواتین مقیم تھے۔ بوڑھا آدمی اس چکلے کا مالک تھا۔ وہ چاروں گندے، دہشت ناک، اور ہمیشہ نشے میں دھت رہتے۔ یہ وہ رنڈیاں تھیں جنھیں پیسے دے کر مرد اپنی شہوت بجھاتے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ ان تھکے ہوئے ٹوٹے جسموں سے بھی کوئی لذت حاصل کر سکتا ہے۔

اور پھر پلی والا وہ شخص۔ جسیم، بے حیا۔ ایک ایسا جسم اور چہرہ جسے وقت نے اخلاق باختہ کر دیا تھا، مجھے اس میں سعید نظر آتا تھا، سعید اگر وہ زندہ رہ گیا ہوتا۔

جنازے کے بعد میرے باپ نے کہا تھا کہ 'خدا تم سے اس لڑکے کی موت کا بھی حساب لے گا'۔ میری دادی کا کہنا تھا کہ میں کھڑا اسے ایک اذیت ناک موت مرتے دیکھتا رہا۔ 'کیا امید کی جاسکتی ہے؟' وہ بولی "جب بھائی، بھائی کو قتل کرے۔' میری والدہ نے کہا تھا کہ میں رونا بند کروں اور جو ہوگیا اب وہ بدل نہیں سکتا۔ انھوں نے برسوں مجھے ایک ناکردہ گناہ کے

احساس میں گرفتار رکھا۔ پھر خود نفرتی اور ندامت کو ایک خود اذیتی کے رویّے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ راتوں کو عفریت سر اٹھا کر میرا خون چوستے، اور مجھے گناہ و زیاں کے احساس میں چھوڑ جاتے۔ میں ان کے دکھائے ہوئے راستے کی مزاحمت کرتا۔ میں ان کے درد کا جواب درد سے دیتا اور خاموشی کا جواب خاموشی سے۔ میں نے انھیں رد کرنا سیکھ لیا۔

میں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنی ماں سے بات کر سکوں۔ ان کی مخصوص محبت بھری تھپکی کی امید میں انھیں بتا سکوں کہ واقع کیا تھا۔ میں انھیں سمندر کی طغیانی کا احساس دلانا چاہتا تھا کہ جب وہ ساحل سے ٹکرا رہا تھا اور میں اس کی ماتمی آواز سن رہا تھا۔ میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ میں اپنے اجداد کی فریاد سن رہا تھا۔ وہ حدت محسوس کر رہا تھا جو ان کی پیشانی کو شکن آلود کر رہی تھی، ان معدوں سے اٹھتی ہوئی ابکائی کو محسوس کر رہا تھا۔ ان کے ریاحی اخراج میں مکئی کی بو اور درد کا آمیزہ محسوس کر رہا تھا۔

لیکن اس سے انھیں جو دکھ ہوتا مجھے اس کا احساس تھا، اور میرا خیال تھا کہ وہ اپنا زیاں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔ میں نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا کہ 'سعید ہماری پہلی اولاد تھا، وہ ہمیں بہت پیارا تھا، اور تم اسے مرتے دیکھتے رہے!' میں اپنے خیالوں میں انھیں یہ کلمات ادا کرتے دیکھتا۔ ان کی ہوا میں موجود فرشتوں کی کہانیوں نے میرے لبوں پر قفل ڈال دیا، شہد کی نہروں کی بات کرتیں، ہواؤں میں موسیقی کا ذکر کرتیں۔ یہ وہ عورت تھی جسے میں نے زندگی بھر درد میں مبتلا دیکھا تھا۔ نہ خود آرام سے رہیں نہ دوسروں کو پہنچا سکیں، انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ کیسے۔

'تم نے مجھے شرمندہ کیا ہے' انھوں نے میری مردانگی کے آغاز سے ایک ہفتہ پہلے کہا تھا 'تمھیں اپنے والد کی جدوجہد کا کوئی اندازہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں تم گلی میں ان کے پاس سے گزرتے ہو تو انھیں پوچھتے بھی نہیں۔ اگر تمھیں ان سے اتنی نفرت ہے تو انھیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ پھر تم ان ہی کا دیا کھاتے ہو لیکن دینے والے کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ وہ سارا دن بندرگاہ پر بیٹھے ان لوگوں کے فارم بھرتے ہیں، جو لکھنا بھی نہیں جانتے۔ تمھارے خیال میں وہ یہ سب کس کے لیے کرتے ہیں۔ کیا تم انھیں عزت بھی نہیں دے سکتے؟ چپ رہو، دوبارہ رونا

مت شروع کردو۔ اب تم تقریباً ایک مرد ہو۔ تم اتنے بڑے کیسے ہو گئے؟ کیا ہم نے تمھیں مایوس کیا ہے؟'

میں رو پڑا تھا، انھوں نے مجھے بانھوں میں لے کر بہلایا۔ مجھے لگا کہ میں پھر بچہ بن جانا چاہتا تھا، ان ہاتھوں میں ناتواں ہونا چاہتا تھا جو بہتر جانتے تھے۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ ہم سب اپنی نفرتوں اور ناراضیوں کے ساتھ اس طرح جیتے ہیں۔

سورج سے دھلی ہڈیوں جیسی سفید ریت کا ساحل ۔ چھوٹے کیکڑے میرے پاؤں سے بچنے کے لیے چھوٹے سوراخ کر کے ان میں چھپ رہے تھے، میں نے ایک کا تعاقب کر کے اسے کچل دیا، اور پھر وقار کے ساتھ دفنا کر گھر کا رخ کیا۔

(۲)

مردانگی بنا کسی طمطراق کے وارد ہوگئی۔ نہ کسی دنبے کی قربانی، نہ کوئی عصا نہ کاغذ، نہ کوئی حکم کہ جا کر خدا اور قسمت کو تلاش کرو۔ کبھی کبھار مذاقاً میرے لیے دلہن تلاش کرنے کے بارے میں میرے ابا کوئی مذاق کرتے تو میری والدہ ایک خوں خوار نظر سے اس معاملے کا خاتمہ کر دیتیں۔ اسکول میں لڑکوں کو معلوم تھا کہ اب وہ مرد بن چکے ہیں ہمارا بس چلتا تو ہم کسی بھی استاد کا حکم ماننے سے انکار کر دیتے۔ ہم سب نے سنجیدگی سے مستقبل کی گفتگو شروع کر دی۔ آزادی کتنی نزدیک تھی اور ہم ان امکانات کا ذکر کرتے جو اس آزادی کے سبب ممکن تھے۔ لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ اور میرے خیال میں ہمیں یہ بات اس وقت بھی معلوم تھی جب ہم اپنے آپ کو یکجہتی اور نسلی ہم آہنگی کے فریب میں مبتلا کر رہے تھے۔ عربوں، ہندوستانیوں اور یورپیوں کے ہاتھوں افریقیوں سے زیادتی اور جبر کی تاریخ کے پس منظر میں بہتر حالات کی امید ہماری فکر کی معصومیت تھی۔ اور اگر تفرقہ بازی بظاہر نظر نہ بھی آتی تو بھی مراعات کی تقسیم میں فوقیت کی روش تو دیکھی جا سکتی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ ہم آزادی کے خواب کی بے وفائی کو بڑھتی ہوئی برافروختگی کے ساتھ دیکھتے رہے۔

آزادی کے تین سال بعد یہ بات صاف ظاہر ہوگئی تھی کہ ہمیں مستقبل کہیں اور تلاش کرنا

ہوگا۔ اسکول ختم ہونے کا زمانہ آیا تو ایک دن میں دوپہر میں اپنے والد کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ مجھے ان کے ستانے کے بعد نہا کر کپڑے تبدیل کرنے تک انتظار کرنا تھا۔ جب تک وہ تیار ہوئے، دیدہ زیب، امارت کی ہلکی خوش بو کی لپیٹ میں، تو کافی دن بیت چکا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑے مسکراتے رہے اور زیرِ لب لفظ انگلستان دہراتے رہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر ہنس کے چلے جائیں گے، جاتے ہوئے مجھ پر کوئی فقرہ اچھال دیں گے۔

'کیا تم اسکالرشپ کے حصول کے لیے سوچ رہے ہو؟' انھوں نے دریافت کیا

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے بھی مسکرا کے سر ہلا دیا۔

'وہ تم حاصل نہیں کر سکو گے' وہ بولے

میں نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پیروں کی قینچی بنا کے وہیں بیٹھ گئے۔ کرسی پر پشت کی جانب ٹک کر، انھوں نے اپنی ٹھوڑی ہاتھوں پر رکھ لی۔

آزادی کے بعد انھوں نے اپنے لیے وزارتِ کار کے آفس میں ایک نوکری حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے آپ کو ایک معزز اور کمیونٹی کی ذرا نسبتاً نمایاں شخصیت کے طور پر پیش کیا تھا۔ انھوں نے اپنے پرانے دوستوں کو بھی مکمل طور پر ترک نہیں کیا تھا۔ لیکن اب وہ ان سے چھپ کر اور کبھی کبھار ہی ملتے۔ اب وہ اپنی حیثیت کے لحاظ سے ملبوس ہوتے اور صندل کی خوش بو لگاتے۔ وہ اب بھی رنڈیوں کے پیچھے بھاگتے اور کچھ راتوں کو شراب میں لڑکھڑاتے ہی گھر میں داخل ہوتے۔ ہم بیٹھک میں تھے، جسے میں کبھی سعید کی موت سے جدا نہیں کر سکا تھا۔ ہمارے پاؤں ایک دوسرے کو چھو رہے تھے۔ انھوں نے اپنے کف پر سے گرد جھاڑی، صبر سے ایک آہ بھری اور میری جانب سوالیہ نظر ڈالی:

'تو تمھارے پاس پیسے کہاں سے آئیں گے؟' انھوں نے پوچھا 'یہ حکومت تو تمھیں دے گی نہیں۔ تم ایک شیطان کی طرح ذہین ہو۔ وہ کسی عربی زنگی پر تو پیسا ضائع نہیں کریں گے۔ سوائے اس کے کہ تم کیوبا جا کر آزادی کے سپاہی بن جاؤ، یا تم بلغاریہ جا کر اسپارینٹو سیکھنا چاہتے ہو؟ تم وہاں پہنچو گے کیسے؟'

'میں وہاں پہنچ کر کام ڈھونڈ لوں گا، کماؤں گا اور پڑھوں گا' میں بولا

'اور میں پانی کی بالٹی میں منہ ڈال کر غرارے کروں گا' وہ بولے 'لیکن اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ تمھیں اندازہ نہیں یہ معاملات کس قدر دشوار ہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ تم وہاں تک پہنچو گے کیسے؟'

وہ میری طرف متوقع نظروں سے دیکھنے لگے،، مگر میں کچھ نہ بولا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں وہاں تک کس طرح پہنچوں گا، میں راستہ نکال ہی لوں گا۔ وہ بے صبری سے منہ بند کیے ہنس دیے۔ 'اس قسم کے کام کے لیے بہت ہمت درکار ہے' وہ بولے

میں نے نیم دلی سے سر ہلا دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ انھوں نے میرا تمسخر اڑا کے مجھے باہر نہیں نکال دیا تھا، نہ ہی یہ شکایت کی تھی کہ میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ جب انھیں معلوم ہوگا تو وہ غصہ ہوں گے، اسی لیے میں یہ کدورت جلد ختم کرنا چاہتا تھا میں کوئی بھی مشورہ سننے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر ہنسے اور سر ہلایا۔

ان کی آستینوں پر گرد دوبارہ جم رہی تھی۔ کھلی کھڑکی سے باہر کھیلتے بچوں کی چیخ و پکار کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سفیدی ہوئی دیواروں سے گرمی کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

'ایک منٹ ٹھہرو' وہ بولے

وہ جلدی سے گئے اور بیڈ روم سے افریقہ کا ایک بڑا نقشہ اٹھا لائے۔ انھوں نے اپنی پتلون اوپر کھینچی اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر نقشہ سامنے پھیلا لیا۔

'یہ ایک پرانا نقشہ ہے' وہ بولے اور میری طرف نگاہ کی جیسے انھیں امید ہو کہ میں کچھ بولوں گا۔ وہ وہاں بیٹھے بے وقوف لگ رہے تھے، لیکن میں نے اس خیال کو بھی اس ڈر سے دل سے نکال دیا کہ کہیں میری سوچ میرے چہرے سے ظاہر نہ ہو جائے۔ انھوں نے فیصلہ کن انداز میں جھیل ٹانگنزا کی سمت اشارہ کیا، جیسے کہہ رہے ہوں کہ 'ہم یہاں خیمہ زن ہو کر صبح سویرے دشمن پر حملہ آور ہوں گے' انھوں نے کمپالا سے راستہ نکالا، وہاں کون جائے گا بھلا؟ یہ راستہ بحر الغزال سے ہوتا نیل کی جانب گیا۔ میں نے اپنے آپ کو قلوپطرہ کے بجرے پر تصور کیا۔ کانسی اور نقرئی پانی سے جھلملاتا اس کا فوارہ ایک عظیم الشان علامت کی مانند استوائی سورج کی سمت لپک رہا تھا۔ 'سارا راستہ یہاں سے اسکندریہ تک' وہ بولے۔

پھر انھوں نے واپسی کے راستے پر انگلی پھیری، اسکندریہ فاتح اعظم کا شہر، اور یہاں ہے روویزوری (Ruwenzori) دوسر والا ماہتابی پہاڑ، اٹھتے طوفانوں کی راہ میں للکارتا۔ اور یہاں ہے اڈووا (Adowa) جہاں بھکشوؤں نے اطالوی عزت تاراج کی تھی۔ تانا (Tana) کے دہانے پر شیرازی شہزادہ، اپنے مالک کے غضب سے مفرور، اس نے یہیں بیٹھ کر اپنی مقعد صاف کرتے ہوئے نیلگوں نیل کو دریافت کیا تھا۔ وہ اپنے جوش پر خود ہی ہنس پڑے۔

'ہاں، تم چلے جاؤ' انھوں نے ایک آہ بھر کر اپنی کرسی پر دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا 'انھیں دکھا دو کہ ہم ابھی ختم نہیں ہوئے۔ جو زیادتی وہ ہمارے ساتھ روا رکھتے ہیں۔۔۔۔' انھوں نے جھک کر اپنا ہاتھ میری ران پر رکھ دیا۔ 'صرف ایک بات، جب تم ان اجنبی جگھوں پر جاؤ تو خدا پر اپنا یقین مت کھونا۔'

وہ ہنسے اور پیچھے ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر بے ساختہ ہنس پڑے، اور بولے 'تم بہت پر اسرار ہو۔ اپنی ماں کو نہ بتانا وہ رونا شروع کردے گی۔ یہ میرے اوپر چھوڑ دو۔ لیکن پہلے تمھیں ایک پاسپورٹ درکار ہے۔ میں امیگریشن کے شعبے میں ایک شخص سے واقف ہوں، وہ ہماری مدد کر دے گا' انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بتایا کہ اسے رشوت دینی پڑے گی۔ انھوں نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔

'پاسپورٹ مجھ پر چھوڑ دو،' وہ بولے 'ابھی مجھے جانا ہے۔ یہ ایک یادگار سفر ہوگا، کاش میں بھی جوان ہوتا۔'

انھوں نے اپنی آستین الٹ کر پھر گھڑی پر نگاہ کی اور چلے گئے۔ وہ مجھے میری سوچ سے زیادہ پر امید چھوڑ گئے۔ یہ ہمارے درمیان خفیہ سازش بن گئی، ہم جب بھی تنہا ہوتے اسی موضوع پر بات کرتے۔ میری امید جلد ہی دم توڑنے لگی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ میرے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ اور ان کا جوش، افسروں کو رشوت دینے کی کوشش کی کہانیاں محض افسانے تھے، ایک مفصل جھانسا۔ کبھی کبھار مجھے ان کے چہرے پر ایک اطمینان بخش شیطانیت کی جھلک نظر آتی۔ مجھے یہ یقین کرنے میں تامل تھا کہ وہ میرے ساتھ اتنا تفصیلی اور سنگ دلانہ کھیل کھیلیں گے۔ پھر ہماری ابتدائی گفتگو کے کئی ہفتوں کے بعد وہ ایک سہ پہر بہت خراب موڈ میں گھر واپس

آئے۔ وہ کسی سے نہیں بولے، لیکن یہ تو کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لیتے، مجھے پتا تھا کہ کسی نہ کسی طرح میں ان کے غصے کی وجہ ہوں۔ میں گھر سے نکل گیا اور دوپہر سڑکوں پر گزار دی، تا کہ ان کا سامنا نہ ہو۔

میں گھر واپس لوٹا تو وہ مہمان کمرے میں میرے منتظر تھے۔ میں پاس سے گزرنے لگا تو انھوں نے مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ پھر بڑبڑاتے ہوئے ایک غصہ ور جلّاد بن چکے تھے۔ گھر میں شدید گرمی تھی، اور ہر طرف سے مٹی اڑ کے ہوا میں شامل ہو رہی تھی۔

'کہاں تھے تم؟' انھوں نے پوچھا، پسینے کے غصہ ور قطرے ان کے ماتھے پر بکھرے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے معمول کے مطابق اپنا سہ پہر کا قیلولہ کیا تھا اور نہ ہی نہائے تھے، اور خود کو اس طیش کے تابع کر لیا تھا۔ میں اس امید میں خاموش رہا کہ شاید وہ ہی بولتے رہیں گے اور مجھے بولنے کی ضرورت نہ پڑے۔ اس امید میں کہ وہ اپنے غصے اور مایوسی کا اظہار کر کے مجھے تنہا چھوڑ دیں گے۔ وہ غرا کے میرے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

'میں بندرگاہ کی طرف نکل گیا تھا' میں نے جواب دیا۔

''میں یہاں تمھارا انتظار کر رہا ہوں' وہ پھٹ پڑے 'میں نے غسل تک نہیں کیا، اور جناب بندرگاہ پر تفریح کر رہے تھے۔ تمھیں یہ چاہیے، تمھیں وہ چاہیے۔ لیکن تم چاہتے ہو یہ سب تمھارے لیے کوئی اور کر دے۔ تمھیں تو اس بات کی بھی پروا نہیں ہے کہ تمھاری وجہ سے لوگوں کو کتنی بے عزتی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ میں یہ تمام مشکلات اٹھا رہا ہوں اور تم گودی کی سیر کر رہے تھے۔' وہ اچانک کھڑے ہوئے تو میں اس خوف سے تن گیا کہ اب وہ مجھے مارنے والے ہیں۔ انھوں نے اس کرسی کی طرف اشارہ کیا جہاں ابھی خود بیٹھے ہوئے تھے۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے ٹہلنے لگے، مڑ کر ہر تھوڑی دیر بعد مجھے گھورتے۔ میں اب اس کھیل سے بیزار ہو رہا ہوں، میں نے سوچا، اب میں بھی ایک مرد ہوں۔

'میرا خیال رکھنے والا کوئی نہیں تھا' وہ اچانک بولے 'میرا کوئی باپ نہیں تھا، کیا تمھیں معلوم ہے؟ لیکن مجھ سے تمھیں یہ امید ہے کہ میں ان تمام لوگوں سے ملوں، اور یہ سب بے عزتی برداشت کروں۔ لیکن تمھیں کیا فرق پڑتا ہے؟ تم تو جا کر گودی میں کھیل رہے ہو۔'

کھڑکی میں کھڑے ہوئے انھوں نے ایک ہاتھ سے کھڑکی کی سلاخ پکڑی ہوئی تھی۔
'میں نے آج امیگریشن والے آدمی سے بات کی تھی' وہ بولے۔ ان کی آواز اب نرم تھی، اور وہ میری مخالف سمت میں دیکھ رہے تھے۔ 'اس نے بتایا کہ اب میں ایک نئے قانون کے تحت پاسپورٹ کے لیے درخواست نہیں دے سکتا، کیوں کہ میں جیل جا چکا ہوں۔ کیا تمھیں معلوم ہے کہ میں کبھی جیل گیا تھا؟' چہرے کا تاثر بدلے بغیر یہ سوال بہت روانی میں کیا گیا تھا۔ انھوں نے حلق صاف کر کے، وہ بلغم نگل لیا جو ان کے حلق میں جمع ہو گیا تھا۔ میں نے انھیں درزی کے کباڑ خانے میں تصور کیا۔ گلے سڑے پھلوں اور بکری کے پیشاب اور مینگنیوں میں لبی زمین پر ان کے قدموں میں ایک چھوٹا لڑکا رو رہا ہے۔ میں نے تصور میں انھیں اس دل برداشتہ لڑکے پر برستے دیکھا۔ اتنا کافی ہے تمھارے لیے؟
'بہتر یہی ہے کہ اس بات کی حقیقت تم مجھ سے سنو' وہ تیوریوں پر بل ڈال کر بولے 'میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔۔۔۔ لیکن لوگ فراموش نہیں کرتے۔'
وہ لڑکا اب گلیوں میں چیتھڑے لٹکائے پھر رہا ہے، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ چھوٹے بچے اسے چھیڑتے ہیں، مذاق اڑانے کے لیے اس کی پتلون نیچے کھینچتے ہیں۔ اب وہ میری طرف دیکھ رہے تھے، کوئی ردِعمل، ہم دردی ڈھونڈ رہے تھے۔
'انھوں نے مجھ پر ایک آٹھ سالہ لڑکے سے زبردستی کرنے کا الزام لگایا' وہ دانت پیس کر بولے 'ایک ذہنی طور پر معذور بچہ جو سڑکوں پر سوتا تھا' وہ پھر رک کر مجھے دیکھنے لگے، مگر میں نے کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں ایک رحم کی اپیل مسترد کر رہا ہوں، مگر میں اس وقت اس بات کی اہمیت جاننے کے لیے بہت کم عمر تھا۔۔ وہ واپس کھڑکی کی جانب لوٹے اور کچھ دیر وہیں کھڑے رہے۔
'میں بے قصور تھا' وہ میری طرف رحم طلب آنکھوں سے بولے 'انھیں کوئی معمولی سا آدمی چاہیے تھا جس پر الزام رکھ سکیں۔ تم سمجھ رہے ہو؟'
میں نے اثبات میں سر ہلا دیا، انھوں نے ایک گہری سانس لی۔
'انھوں نے مجھے تین مہینے بعد رہا کر دیا' وہ بولے 'اسی سے بے گناہی ثابت نہیں ہو

جاتی؟ تب ہم اس چاروں طرف سے رنڈیوں کی غلاظت کے ڈھیر میں گھرے علاقے میں رہنے آگئے، لوگ فراموش نہیں کرتے۔'

انھوں نے گھڑی کی جانب دیکھا اور پھر کھڑکی سے باہر گلی پر نظر ڈالی 'مجھے نہالینا چاہیے' انھوں نے آہ بھری۔

'تمھاری ماں۔۔۔میرے لیے بڑا سہارا تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی، وہ واقعی بہت خوب صورت تھی' انھوں نے نرمی سے دہرایا 'تمھیں پتا ہے جب میں نے اس سے شادی کی تھی تو وہ تمھاری ہی عمر کی رہی ہوگی؟'

وہ پھر سر ہلا کر کچھ بڑبڑائے جو مجھے سنائی نہیں دیا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ اور ایک طویل وقفے کے لیے کچھ نہ بولے۔ گرم ہوا کا ایک جھونکا کمرے میں گھس آیا۔ ہماری زمین کی دھیرے دھیرے سرکتی ہوئی ہوا، ہمیں گرد آلود زندان میں تازگی کا احساس دلاتی۔ شام کی تیرگی پھیل رہی تھی۔ وہ میری سمت مڑے تو میں نے دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔

'وہ بہت بڑا سہارا تھی' وہ بولے

ایک کار باہر آکر رکی اور اس نے دو بار ہارن دیا۔ اس کا ریڈیو بلند آواز سے بج رہا تھا۔ انھوں نے باہر جھانک کر ہاتھ ہلایا 'مجھے کپڑے بدلنے ہیں، جا کر ان سے کہو تھوڑی دیر انتظار کرلیں' وہ مجھ سے بولے۔

وہ بہت خوب صورت تھیں جسے انھوں نے ایک دردناک مخلوق میں تبدیل کر دیا تھا۔ سعید، تم زخمی بدذات، کیا تم جانتے ہو وہ ان کا کتنا بڑا سہارا تھیں۔ اب انھیں جہاں سہارا ملتا ہے، وہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ مجھے ان کی بات کا یقین نہیں آیا تھا، اور مجھے ڈر یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہوا تھا اب اس کی حقیقت کوئی معنی رکھتی بھی نہیں۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے ان کی راتیں شراب اور رنڈیوں کی معیت میں گزرتی ہیں، اور ہم سب ایسے بن جاتے کہ جیسے جانتے ہی نہیں ہوں کہ وہ کہاں جاتے ہیں۔ ہم ایسے کھاتے اور زندہ رہتے جیسے کوئی غیر موجود نہ ہو۔

اور جب وہ صبح دروازوں سے ٹکراتے گھر واپس آتے، فحش گالیاں بکتے، ماں پر ہاتھ اٹھاتے تو ہم سب سوتے بن جاتے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ انھیں روکنے کے لیے کچھ تو کر سکتا ہوں۔ میں ہی سب سے بڑا تھا، ان سے قد میں چند انچ ہی کم۔ شاید ہم سب واقعی اتنے ہی بے عمل تھے کہ جتنا وہ ہمیں سمجھتے تھے، لیکن میں اپنی ماں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چھوٹی سعیدہ تک واقف تھی کہ اسے کیا کردار ادا کرنا ہے۔ کسی نے ہمیں ایسا کرنا سکھایا نہیں تھا۔ ہم یہ سب اس لیے کرتے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہماری ماں کتنی شرمندگی محسوس کرتی ہے، ہم سب کتنی شرمندگی محسوس کرتے تھے۔ دن میں شب کے واقعے کا ذکر ہی نہ ہوتا، جیسے رات کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ ہم تذکرتا بھی ان کی شراب نوشی یا تشدد کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ ایسی جگہوں پر مارتے کہ نشان نظر نہ آئے۔ لیکن پھر بھی ہم ان سے نظریں چرانے کے سوا کچھ نہ کرتے۔ دن کے وقت ہمارا باپ ایک غضب ناک مالک تھا۔ جس کے الفاظ کو خدا کی جانب سے اقتدار کی منظوری حاصل تھی۔ میرے خیال میں ہمارا ان سے خوف اور عزت کا تصنع انھیں ہم سے اور زیادہ متنفر کرتا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر انھیں ذکیہ کے حمل کا پتا چل جائے تو یہ کیا کریں گے؟ ان کی عزت کا احساس انھیں کچھ انتقام لینے پر اکساتا، بلکہ کسی بھی باپ یا بھائی سے اسی قسم کی امید کی جاتی۔ اسی لیے سب نے اس بات کو ان سے چھپایا۔ بی مکبوا، میری دادی، اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے ساتھ لے جا کر کسی دوست کے ہاں ٹھہر گئیں، اور وہاں سے واپسی پر ذکیہ کم از کم کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، صاف اور پارسا بن گئی۔

ذکیہ بہت عجلت میں بالغ ہوگئی تھی۔ کم عمری سے ہی اس نے 'چھوٹی' کا کردار ادا کرنا ترک کر دیا تھا، جو بچیوں سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ اسے ابھرتی جوانی کا پہلا اشارہ نو برس کی عمر میں ملا، جب اسے کالا عبایہ پہننے پر مجبور کیا گیا تھا، اور باہر گلی میں کھیلنے کی ممانعت ہوگئی تھی۔ میری دادی نے آسمان پر منڈلاتے ایٹم بم اور مردوں کی کہانیاں سنانی شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے ذکیہ کے لیے بر تلاش کرنے کا ذکر کیا تو ذکیہ نے ان کا مذاق اڑایا اور بھاگ کر جان بچائی، ورنہ دادی اس بے عزتی پر اسے تھپڑ مارنا چاہتی تھیں۔ اس قسم کی کسی پابندی کا اس کی روش اور جارحانہ دلآویزی پر کوئی اثر نہ پڑا، اور اس نے اپنے اتالیقوں، میری ماں اور دادی،

سے بچ نکلنے کے گر سیکھ لیے۔ وہ اسکول کے ایک ڈرامے میں حصہ لینا چاہتی تھی، لیکن دادی نے اس پر پابندی لگا دی۔ وہ سائیکل چلانا چاہتی تھی لیکن اسے اجازت نہ ملی۔ اسے سمجھایا گیا کہ سب سے پہلے وہ کھانا پکانا سیکھے۔ جب وہ بارہ برس کی ہوئی، تو اسے اس لیے اسکول سے اٹھا لیا گیا کہ اسے سرکاری سیکنڈری اسکول میں جگہ نہ ملی۔ اور فیس دے کر اسے کسی پرائیوٹ اسکول میں بھیجنا میرے والد نے زیاں سمجھا۔ کبھی کبھار وہ میری کتابیں عاریتاً لے لیتی۔ مجھے یاد ہے کہ رومیو جولیٹ پڑھ کر وہ کتنا روئی تھی۔

یہ بعد کی بات ہے۔ جب اس کا حمل دریافت ہو کر ختم بھی کرا دیا گیا تب اس نے مجھے اپنے عاشق کے بارے میں بتایا۔ یہ اس کے پرانے اسکول کا ایک استاد تھا، ایک دیسی لڑکا جس کی یہ پہلی نوکری تھی۔ اس وقت وہ میرا ہم عمر ہی رہا ہوگا۔ ذکیہ کہنے لگی کہ نامعلوم اس کے ساتھ کیا ہوا، لیکن وہ معلوم کرنے سے بھی خوف زدہ تھی۔ اس نے مجھ سے معلوم کرنے کی التجا کی۔ میں اب سوچتا ہوں کہ اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ میں ایک ڈنڈا لے جا کر اس کی بے عزتی کا بدلہ لوں گا، یا کم از کم اس کی شکایت درج کراؤں گا۔ میں نے اس کی خاطر معلومات حاصل کی تو معلوم ہوا کہ اس نے کسی اور قصبے میں اپنا تبادلہ کرا لیا ہے۔ انھوں نے یہ بات میرے والد سے چھپائی لیکن لگتا تھا کہ اس واقعے نے ذکیہ کی خودداری کے سارے بندھن توڑ دیے۔ اب سولہ برس کی عمر میں وہ کسی کسبی عورت کی مانند، بنا کسی امتیاز کے ایک معاشقے سے دوسرے معاشقے کی طرف رواں رہتی۔ میں اس کے رویّے کے ابتدائی صدمے سے جاں بر ہوا، تو مجھے اس کا وہ انبساط سمجھ میں آنے لگا جو وہ اس سے حاصل کرتی۔ سڑک پر وہ بے حیائی سے اپنی خوب صورتی کا پرچار کرتی، اور جو ستائشی جذبے وہ بیدار کرتی ان پر بہت مسرور رہتی۔ ہوش مندی کے لمحات میں وہ اپنی آزادی کی قیمت سے واقف تھی۔ میں نے کوشش کی کہ اسے سمجھا سکوں، لیکن میں اسے ایسی کیا بات بتاتا جو اسے پہلے سے معلوم نہ رہی ہو، کہ اپنی بربادی کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی عورت کیا قدم اٹھاتی؟ کہ اس کے پاگل پن کی یہ غضب ناکی بالآخر اسے مسترد اور پامال چھوڑے گی۔ اس نے مجھے نظر انداز کر دیا۔ اپنی فتوحات کے نشے میں سرخ اور اپنی نئی طاقت سے چور اس کا مستقبل بہر حال طے ہو گیا تھا۔ جلد یا بدیر جب

حالات مشکل ہوں گے، تو اگر وہ بہت خوش قسمت ہوئی تو زیادہ سے زیادہ کسی کی رکھیل بن جائے گی۔

میری ماں نے اس سے التجا کی۔ روز جب میں امتحان کی تیاری میں صحن میں چٹائی پر لیٹا امتحانات کے لیے سبق دہرا رہا ہوتا، تو مجھے ان کی سرگوشیاں سنائی دیتیں۔ لالٹین کی روشنی میں صحن کے دوسرے کنارے پر بیٹھی میری ماں دکھ سے رونے لگتی، اور آخر کار ذکیہ بھی رو دیتی۔ دل چاہتا تھا کہ جا کر میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں۔ لیکن ڈرتا تھا کہ وہ میری تسلی مسترد کر دیں گی۔ ذکیہ وہ بن گئی تھی جس کا ہم ذکر نہیں کرتے۔

انھوں نے یہ سب مجھ سے بھی پوشیدہ رکھنا چاہا کہ مردوں کو اس قسم کی چیزوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ میں جو بھی جذبہ دکھاتا وہ اس سے خوف زدہ ہی ہوتے، کہ اس سے میری کم زوری ظاہر ہوتی۔ ایک بار میں نے ہم دردی سے ذکیہ کے بال سہلائے تھے تو میں نے دادی کی آنکھوں میں تجسس کی لہر دیکھی تھی۔

میری اپنے والد کے ساتھ پاسپورٹ کی سازش ہماری اس دوپہر کی گفتگو کے ساتھ انجام کو پہنچی۔ اب امیگریشن افسروں کے بارے میں کسی معنی خیز نظروں یا سرگوشیوں کا تبادلہ نہیں ہوتا تھا۔ یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی کہ ملنے کا کوئی امکان نہیں، میں نے پاسپورٹ کی ایک سرکاری درخواست جمع کرادی۔ پھر امتحان بھی نزدیک آرہے تھے اور دوسرے تمام مسائل پر فوقیت رکھتے تھے۔ میں دوپہر اسکول میں سبق دہراتے گزارتا اور پھر میدان میں تھکا دینے والی دوڑ لگاتا۔ یہ تھکا دینے والی مشغولیت مجھے مطمئن رکھتی۔ سارا وقت ایک مقصد کے حصول کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ میں اس محنت کے اکارت جانے کے بارے میں سوچتا بھی نہیں تھا۔ امتحان کے تو شاید نتائج بھی شائع نہ ہوں۔ اس خدشے سے کہ کہیں ہم بہتر مستقبل کی تلاش میں باہر نہ چلے جائیں۔ اسکول میں امتحان دینے والے طلبہ غرور سے پھرتے، اساتذہ بھی ان کی ناز برداری کرتے، اور کم عمر لڑکے انھیں احترام سے دیکھتے۔ ہمارے دہرانے کے وقت کی کم عمر لڑکے نگرانی کرتے۔ جو ہماری جاں فشانی کی فرضی داستانیں تراشتے، جیسا کہ ہم نے اپنے سے پہلے فارغ ہونے والے طلبہ کے ساتھ کیا تھا۔

میں اول شام گھر آتا تو اکثر گھر خالی ملتا۔ میری والدہ اور بی مکسوا عموماً دوپہر میں ملنے ملانے نکل جاتیں، یا عورتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تقریبات میں مدعو ہوتیں۔ سعیدہ کبھی ان کے ساتھ چلی جاتی لیکن زیادہ تر وہ کسی میدان میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہی ہوتی۔ میں صحن میں اپنی چٹائی پر لیٹا پڑھتا رہتا۔ تھکاوٹ کی مدہوشی میں غنودگی کا شکار ہوتا۔ میں جب بھی اس حال میں ہوتا تو دادی کو اس بات میں بہت مزا آتا کہ وہ چپکے سے قریب آ کر کوئی بہت حوصلہ افزا جملہ کہہ دیں، مثلاً 'تم فیل ہو جاؤ گے۔'

گزرتے وقت کے ساتھ ان کی بے رحمی احمقانہ حد تک مضحکہ خیز ہو گئی تھی۔ اب کوئی انھیں اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ سارے گھر میں پھرتی رہتیں۔ ان کے کان اور آنکھیں کسی بے عزتی کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ 'وہ تمھیں پاگل خانے میں بند کر دیں گے۔' یہ جملہ انھیں بہت پسند تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس قسم کے فقرے پر ہنسنا بھی بے رحمی ہے۔ کبھی وہ اپنی انگلی اٹھا کر مجھے تنبیہ کرتیں، پھر اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ زور سے بند کرتیں اور اندر سے کنڈی چڑھا لیتیں۔ اس کے باوجود بھی جب وہ کسی تقریب سے واپس آتیں تو میرے لیے بھی کیک کا ٹکڑا یا مٹھائی ضرور لے آتیں 'جانور کو کھانا دے رہی ہوں' وہ کہتیں تو ان کے بیمار پھیپھڑوں سے خرخراہٹ بھرا قہقہہ بلند ہوتا۔

میل ملاقات اور یہ تقریبات میری ماں کے لیے بہت اہم تھیں۔ یہ سب اس نئے احترام کا حصہ تھا جو نئی نوکری کی وجہ سے ہمیں مل رہا تھا۔ اب وہ اپنے لباس پر توجہ دینے لگیں تھیں، خاص طور پر کہیں باہر جاتے ہوئے۔ پھر ذکیہ انھیں مزید بڑھاوا دیتی 'ارے لڑکی، مجھے مضحکہ خیز تو نہ بنا دے اب' وہ کہتیں، لیکن اب وہ پرفیوم استعمال کرنے لگیں تھیں، اور آنکھوں میں کاجل بھی۔ اب وہ گھر گھر کپڑا فروخت کرنے والوں سے پاپلن، تافتان اور ریشم کے تھان خرید کر درزی کے پاس لے جاتیں۔ شام ہونے پر وہ پھر اپنے پھٹے پرانے حلیے میں لوٹ آتیں اور صحن میں رات کے کھانے کی فکر میں گھومتیں۔ ایک تھکا دینے والے دن کے اختتام پر وہ برآمدے میں چٹائی پر عبادت کرتیں، اور وہیں تھک کر قیلولہ کرنے لیٹ جاتیں۔ یہی وقت ہوتا کہ مجھے نیند میں ان کے کراہنے کی آواز آتی، جب کہ میں ان سے چند گز کے فاصلے پر تیل

کے چراغ کی روشنی میں کتابوں پر نظر ڈال رہا ہوتا۔

جب کوئی گھنٹا بھر بعد وہ بیدار ہو جاتیں تو ہم باتیں کرتے۔ وہ جان بوجھ کر مجھ سے براہ راست اسکول کے بارے میں تیکھے سوالات کرتیں۔ ان کا مقصد سادگی کی حد تک واضح ہو جاتا، لیکن پھر بھی میں اپنی معلومات دکھانے سے گریز نہ کرتا۔ کبھی میری باتوں کے درمیان ہی وہ اونگھنے لگتیں۔ میں بے دردی سے انھیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیتا کیوں کہ ابھی میں نے کلورین بنانے یا اس قسم کے کسی اور تجربے کے تمام عوامل کا بیان مکمل نہیں کیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ان سے اپنی روانگی کے بارے میں بات کر لینی چاہیے، لیکن جب بھی اس کا موقع آتا تو میں بزدلی اوڑھ لیتا۔ میں نے اس شام کا انتظار کیا کہ جب جس دوپہر وہ گھر سے باہر نہ نکلی ہوں، تو اتنی تھکی ہوئی اور مصروف بھی نہ ہوں۔

ایک روز میں اسکول سے لوٹا، تو انھیں صحن میں پایا۔ وہ اکڑوں بیٹھی آگ جلا رہی تھیں، میں بھی ان کے نزدیک اکڑوں ہی بیٹھ گیا۔ یہ موقع مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ یہ سب چھوڑ کر کہیں جانے اور ایک بہتر مستقبل کی بات اب مجھے ایک غیر ذمہ دارانہ خواہش لگنے لگی تھی، اور یوں اس کے پورے ہونے کا امکان بھی کم ہی تھا۔ انھوں نے آسمان کی جانب دیکھا اور دوبارہ برتنوں میں جُت گئیں۔

'تمھارا کیا خیال ہے، بارش ہوگی؟' آخر وہ بولیں۔

آسمان کئی دنوں سے تاریک تھا اور دن کے وقت حبس بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ ایک آندھی پہلے ہی آچکی تھی، جس سے ہوا نے مٹی کو غصہ ور بگولوں میں بدل دیا تھا جو چاروں طرف ناچ رہے تھے۔

'نہیں' میں نے کہا 'میرے خیال میں ابھی چند روز اور لگیں گے۔'

انھوں نے دوبارہ آسمان کی جانب دیکھا اور پھر میری جانب۔

'آج رات بارش ہوگی' وہ بولیں 'تمھیں اس بارے میں نہیں پتا۔ اتنے دنوں سے یہ گرمی اور دھول پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اب بارشوں کا موسم ہے۔ دیہاتوں میں تو لوگ اس کے لیے دعائیں مانگ رہے ہوں گے۔ آج بارش ہوگی۔ مجھے ان چیزوں کا پتا ہے' وہ مجھے چھیڑتے

ہوئے بولیں

'کیا پکارہی ہیں؟' میں نے پوچھا

'انھوں نے صبر آمیز آہستگی سے پلکیں جھپکائیں۔ دوبارہ پھر وہی کیلے۔ کیا حالات اتنے خراب تھے؟ اب انھوں نے کسی طرح اخراجات پورے کرنے کی جدوجہد ترک کردی تھی۔ اوجھڑیوں اور چھوٹی خوردنی مچھلیوں کے ساتھ نت نئے تجربات ختم ہو چکے تھے۔ کچھ شاموں میں وہ ہمیں چند پینس دے دیتیں کہ جاکر چائے خانے سے بن اور لوبیا لے لیں۔ ہم کوئی شکوہ کرتے، تو وہ خاموش خطاکار آزردگی سے سن لیتیں۔ وہ خود رات کو شاید ہی کبھی کچھ کھاتیں، لیکن اگر والد گھر پر ہوتے تو ان کے لیے ضرور کچھ تیار کرتیں۔ میرا نہیں خیال کہ مجھے بن اور لوبیا اتنے ناپسند تھے کہ جتنے کیلے۔ میرا نہیں خیال میں انھیں ہم سب کے لیے نہ لڑنے کا مجرم سمجھتا تھا۔ لیکن کبھی جب کیلوں کی ثقیل غذا آنتوں میں گڑگڑاہٹ پیدا کرتی تو دل میں خیال پیدا ہوتا کہ کیا پرفیوم، کپڑوں اور شراب کے مقابلے میں پیسے کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

'بھوک لگی ہے؟' انھوں نے پوچھا 'تم ہمیشہ ہی بھوکے ہوتے ہو!'

انھوں نے ہرے کیلوں کا گچھا اپنی سمت کھینچا اور انھیں توڑنے لگیں۔ انھوں نے رک کے چھلکوں پر لگی کوئی چیز صاف کی، جیسے اس سے کوئی فرق پڑتا۔ ان کا سر کام پر جھکا ہوا تھا، ایک سمت کو ڈھلکا ہوا۔ مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں نے انھیں کھانے کے بارے میں قصوروار کیوں محسوس کرایا۔

'مجھے کیلے پسند ہیں' میں نے کہا

انھوں نے مسکرا کے میری جانب دیکھا 'جھوٹے!'

'آج رات تم نے عبادت کی' انھوں نے موضوع بدل کر سوال کیا 'میرا نہیں خیال تمھیں وقت کا پتا بھی چلا ہوگا۔ آج کل تم اتنے مصروف ہو کہ خدا کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے۔' انھوں نے آسمان کی جانب دوبارہ نگاہ کی، اور ایک ٹھنڈی سانس بھری 'پہلے لوگ بارش کے لیے قربانیاں دیتے تھے۔ گاؤں میں چاول، آٹا اور کبھی کوئی جانور بھی ڈھلان والی چٹان کے مزار پر

لے جاتے۔ راتوں کو روحوں کی آوازیں آتیں۔ جب میں اور میرا بھائی چھوٹے تھے، تو ہم یہی سمجھتے تھے۔ کبھی ہمیں ان کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہ دیہات میں چڑھاوے کی باسکٹ گھسیٹ رہے ہوتے۔ میرا بھائی چاہتا تھا کہ ہم جا کر مزار پر رات بسر کریں۔ تاکہ شاید وہ ہمیں نظر آجائیں۔ میں اس سے کہتی تھی کہ ہم اندھے ہو جائیں گے۔ میرے ابا کہتے تھے کہ یہ سب وحشیانہ رسوم ہیں۔'

'پھر بارش ہوتی تھی؟' میں نے پوچھا

'کیا؟' انھوں نے جیسے کہیں دور سے مجھے دیکھ کر پوچھا 'آج بارش ہوگی، آسمان کو دیکھو۔
'

انھوں نے ایک دھار والی لکڑی سے کیلے کے چھلکے اتارے اور انھیں پاؤں کے پاس پڑے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیا۔ ہر دفعہ وہ کوئی کیلا پھینکتیں، تو ذرا سا پانی اچھل کے ان کے پیروں کو گیلا کر دیتا۔ انھیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

'تم نے بن سعید کے بارے میں سنا ہے؟' انھوں نے پوچھا

میرا ارادہ کم زور ہو رہا تھا اور یہ خواہش سر اٹھا رہی تھی کہ گفتگو ختم کر کے باہر سڑک پر نکل جاؤں۔ وہ اتنی کم زور اور اتنی دکھی لگ رہی تھیں۔ اور میں اپنے جانے کا ذکر نکال کر انھیں مزید دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کم از کم میں نے اپنی ذات کو یہی بزدلانہ عذر فراہم کیا۔

'آج اس نے اپنا کتا مار دیا۔ اس نے اپنی کار اس پر چڑھا دی، وہ کسی ٹماٹر کی مانند پچک گیا، میں نے خود دیکھا تھا، میں وہیں تھا، وہ اٹھ کر اپنے آپ کو گھسیٹنے لگا۔۔۔'

میں جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ وہ مری جانب دیکھ کر مسکرائیں 'تم ہمیشہ سے بہت نرم دل ہو' وہ ہنسنے لگیں

'اب اسے کیا ہوگا؟' میں جانے کے لیے پر تولنے لگا

'وہ اسے جیل میں بند کر دیں گے' وہ استہزائی انداز میں بولیں 'اس کا پورا خاندان ایسا ہی جنگلی ہے۔ ذرا دیکھو تو انھوں نے آپس میں ہی کتنے حرامی جنے ہیں۔'

افواہ یہ تھی کہ بن سعید سالوں میری ماں کا خواہاں رہا تھا، ان کو خطوط بھیجے تھے۔ وہ جو

پڑھنا نہیں جانتی تھیں۔ جو انھوں نے میرے والد کو پڑھا دیے تھے۔ بن سعید اچھے خاندان سے تھا۔ وہ ابوسید خاندان کا چشم و چراغ تھا، جو انقلاب سے پہلے زنزی بار کے حکمران تھے، اور اومان کے فی الوقت بھی حکمران ہیں۔ وہ اصلی غلام برداروں کا پوتا تھا، ایک منفرد آدمی۔ نو جوانی میں سڑکوں پر اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ کالونیل حکم رانوں نے اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لیں تھیں۔ وہ طاقت ور خاندان سے تعلقات بگاڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ایک بار اس نے ایک انگریز ملاح کو قتل بھی کر دیا تھا تو انتظامیہ نے اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ لیکن اب وقت بدل چکا تھا، اب بن سعید اپنی شراب کی بوتل سے محوِ گفتگو رہتا، اور کھڑکی سے باہر جھکا راہ گیروں کو گالیاں دیا کرتا۔ گھر سے باہر قدم نکالتا تو اس کا اختتام ہمیشہ کسی بنا ضرورت تکبر کے مظاہرے پر ہوتا۔ نئی انتظامیہ بھی اسے بہلائے رکھتی، ان کے خیال میں وہ پاگل تھا اور اسے وہ رات بھر کے لیے پاگل خانے میں بند کر دیتے تاکہ اس کا جنون ذرا بیٹھ جائے۔

'میں ذرا دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔' میں نے کہا

میں گھر کی بغلی گلی میں جا نکلا۔ چکلے کا بوڑھا مالک کھڑکی میں بیٹھا، سلاخوں کے پیچھے سے تاریک گلی میں جھانک رہا تھا۔ وہ اکثر ایسا ہی کرتا کہ کھڑکی کے دونوں پلے کھول کر ہمارے گھر کی دیوار کو گھورا کرتا۔ اس کی کھڑکی میری دادی کی کھڑکی سے ذرا ترچھے رخ پر تھی۔ اس کی یہ نگہ داری میری دادی کو سخت ناگوار گزرتی۔ کبھی وہ اگربتی سلگا لیتا اور کبھی شہنائی کے ریکارڈ بجاتا۔

جب میں چھوٹا تھا تو وہ میرے بہت ناز اٹھاتا، مجھے گود میں اٹھا کر میرے گالوں کو سہلاتا۔ میری ماں اس سے اتنی خوف زدہ رہتی کہ اپنے غصے کا اظہار بھی نہ کر پاتی۔ انھوں نے مجھے اس سے خبردار رہنے کو کہا اور بتایا کہ وہ ایک غلیظ آدمی ہے۔ پھر انھوں نے مجھے قسم دلائی کہ میں اسے نہیں بتاؤں گا کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ آخر انھوں نے میرے والد سے بوڑھے کی مجھ پر عنایات کے بارے میں شکایت کی۔ میرے والد نے پہلے تو مجھ پر غصہ نکالا، مجھے ایک کم عمر رنڈی کہا 'کیا کرتا ہے وہ تمھارے ساتھ، سچ بتاؤ مجھے؟' پھر وہ اس بوڑھے کی طرف گئے اور اسے ہر ممکنہ دھمکی دی۔ خصی کرنے سے خدا کے قہر تک۔ لیکن وہ وہاں سے بے عزت ہو کر واپس لوٹے، کیوں کہ بڈھا بھی خاموش نہیں رہا تھا اور اس کے گاہک بھی اس کی کمک کو آ گئے تھے۔

وہ بڈھا اس کی بات مجھ سے کبھی نہ بولا اور جہاں تک ممکن ہوتا میں بھی گلی میں نہ جاتا۔

جب میں اس کی کھڑکی کے پاس سے گزرتا تو وہ ہمیشہ کی طرح منہ بند کرکے ہنسا۔ ایک دفعہ اس کے پاس سے گزرنے کے بعد جب میں نے پلٹ کر دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر نفرت کی ایسی شکل نظر آئی تھی کہ مجھے دوبارہ دیکھنے کی ہمت نہ پڑی۔ مجھے خواب میں بھی وہ دہکتی آنکھیں گلی کی تاریکی میں گھورتی نظر آتیں۔

مزامبارو کے پرانے درخت کے اطراف، لوگ شام کی تیاری کر رہے تھے، تیل کے چراغ جگمگانے لگے تھے۔ ایک ہنڈولے کے نیچے تاش کا کبھی نہ ختم ہونے والا کھیل جاری تھا۔ اس چھوٹے سے میدان کے کناروں پر کباب، مونگ پھلی اور مٹھائی فروشوں کے ٹھیلے کھڑے تھے۔ اودی ریسٹورانٹ کا ریڈیو بلند آواز سے مکانوں، دوستوں اور عزیزوں کے لیے کبھی نہ ختم ہونے والے تہنیتی پیغامات ملا جلا کر نشر کر رہا تھا۔ سعدیہ کسی تاریک گوشے سے بھاگتی ہوئی باہر ہوئی اور میرا ہاتھ تھام لیا۔

'کہاں جا رہے ہو تم؟' اس کے چہرے پر بچوں جیسی خوشی بکھری ہوئی تھی۔ میں نے کوئی جواب دینے کے بجائے اس کے بالوں کی آوارہ لٹیں کھینچنے کی کوشش کی جو اس کے سر کے دونوں جانب لٹک رہی تھیں۔ اس نے میرا ہاتھ دھکیلا اور بھاگ کے واپس بچوں کے اس گروہ میں چلی گئی جہاں سے آئی تھی، وہ اس وقت ٹھیک دس برس کی تھی۔ ٹھیک وہ عمر جب مردوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اس کا بچپنا تھا جس نے اسے اب تک اس فیصلے سے بچایا ہوا تھا۔ وہ ہم سب سے زیادہ خوش نصیب تھی۔ وہ اپنی ذات کو گھر کے ہنگاموں سے بالاتر رکھتی۔ اور اس کے اطراف جو بھی ہو رہا ہو، وہ اس کے اطمینان پر اثر انداز نہ ہوتا۔ میری ماں اسے ہمیشہ خوابیدہ کہتی اور اس کی بے توجہی سے تنگ رہتی۔ سعیدہ اس سے دکھی ہو جاتی اور ایک دو دن وہ یاد سے کپڑے دھونے میں ہاتھ بٹاتی، اپنا اسکول یونی فارم تہہ کرتی، کتابیں سلیقے سے جماتی اور ملاقاتیوں سے چائے کے لیے پوچھتی۔ یہ سلسلہ زیادہ دن نہ چلتا اور وہ پھر جلد ہی اپنی بے فکری میں مگن ہو جاتی۔ عمر کے اس حصے میں اس کی داخلی زندگی میں اتنی خوشیاں تھیں کہ اسے خارجی طور پر اچھا لگنے کی کوئی فکر نہیں تھی۔

شب نے جلد ہی اپنا دربار سجا لیا۔ قصبے بھر کی سڑکوں کو نشان زد کرنے کے لیے بتیاں ٹمٹمانے لگیں، سائے لمبے ہو کر سڑکوں پر پھیل گئے۔ بند کھڑکیوں سے کیروسین لیمپ روشنی کے مرکب باہر پھینکنے لگے۔ میں جہاں سے گزرتا سائے پہلو بدل کر مجھے گھورتے۔ چراغوں کی دھندلی روشنی میں دنیا اپنی اصلی شکل کی بجائے، سطح سمندر پر بہتے کباڑ اور پتھریلے ٹیلوں کا میدان لگ رہی تھی۔ میں گاڑیوں کی مرمت کے خالی گیراجوں اور بند مال خانوں سے گزرا تو لگ رہا تھا جیسے کسی عظیم میزبان کے کیمپ فائر کی باقیات ہیں۔ جیسے اس جگہ کو دوسری جگہوں کے مقابلے میں پڑاؤ کے لیے بنا منصوبہ بندی کے جلدی میں چنا گیا ہو۔ مجھے ایک نیم عریاں لڑکی کی جھلک نظر آئی جو اول شام کے ڈھلتے سایوں میں دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے تیزی سے اٹھتے پر اعتماد قدموں کے ساتھ اس کا سر وقار سے دائیں بائیں جھول رہا تھا۔

میں میدان میں مخالف سمت سے، اودھی ریسٹورانٹ کے نزدیک داخل ہوا۔ یہ روشنی سے جگ مگ کر رہا تھا۔ داخلی دروازے کا سائن بورڈ پتنگوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا، جو چراغوں کی لس کی تڑپ میں بھنبھنا رہے تھے۔ ریسٹورانٹ کے باہر المونیم کی میز کے پیچھے ایک شخص کھڑا چپاتیاں بنا رہا تھا۔ ریسٹورانٹ کے بغل میں ایک پتلی، لمبی گلی تھی جہاں گاہک اپنے پھولے ہوئے مثانے خالی کرتے۔ اس گلی کے نکڑ پر ہماری پیپلز پروگریسیو پارٹی کا دفتر تھا۔ اس کے دروازے پر کالی سیاہی میں یہ الفاظ کندہ تھے 'فوری آزادی'۔ اس کی لکھائی بہت خراب تھی۔ ایک جدوجہد کے وقت کی یہ تحریر اب مدھم پڑ گئی تھی، ایک ایسے وقت کی یادگار جب یہ نعرہ کچھ معنی رکھتا تھا۔

آفس تاش اور ڈرافٹ کھیلنے والوں سے بھرا ہوا تھا۔ اندرونی آفس میں اس شاخ کے چیرمین کا دربار سجا تھا۔ ایک چھوٹے کپ سے کافی پیتا وہ اپنے اطراف خوشامدانہ تند گفتگو سن رہا تھا۔ یہ نو منتخب لوگوں میں سے تھا۔ یہ قابلِ ذکر اور طاقت ور کونسلوں میں ہماری نمائندگی کرتا۔ ہم یہ سبق سیکھ چکے تھے کہ اپنی ہی قسم کے کسی شخص کو اس مقصد کے لیے منتخب نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے کوئی نہیں جو صدیوں سے تمام ظاہری شواہد کے باوجود اپنے آپ کو عرب کہلانے پر مصر ہوتا۔ آزادی نے ہمیں احساس دلایا تھا کہ باقی ملک ہماری تاریخ سے کس قدر تشدد آمیز نفرت کا

شکار ہے۔ ہم صدیوں سے اپنے اختلاطی ملاپ کی اکڑ میں گرفتار تھے، اپنے سوتیلے بہن بھائیوں کا مذاق اڑاتے۔ جب کہ وہ جن سے ہم اپنی نسبت جوڑتے، وہ نہ صرف ہم سے خوب واقف تھے بلکہ وہ ہم سے ایسی نفرت کرتے اور حقارت سے دیکھتے جیسے کسی فعال گنوار اولاد کے حرامی بچے ہیں۔ لہٰذا اب ہم ایسا چیرمین منتخب کرتے ہیں جو ہماری طرح بات نہیں کرتا، اور اپنی اعلیٰ ظرفی میں ہمارے خلاف بہت زیادہ نہیں بولتا۔ وہ واحد آدمی تھا جو کسی کی شدید بیماری پر ہسپتال کو ایمبولینس بھیجنے پر آمادہ کر سکتا تھا۔ اس کی چند سرگوشیاں کسی پولیس والے کو زیادتی کرنے سے روک سکتی تھیں۔ وہ کسی امتحان میں فیل ہونے والے طالب علم کے لیے آخری فیصلہ صادر کر سکتا تھا یا کسی تاجر کے لیے جو اپنا لائسنس کھونے کے قریب ہو۔ لہٰذا اس کے دربار میں حاضری دی جاتی اور وہ کاہلی سے بیٹھا یہ خراجِ تحسین وصول کرتا۔ اس کے دفتر کی دیواریں نعروں اور پارٹی کے قابلِ ذکر لوگوں کی تصاویر سے آراستہ تھیں۔ ہمارے راہ نما کی ایک بڑی تصویر آویزاں تھی۔ جس میں وہ شرمندگی کی حد تک مٹاپے کے ساتھ، شراب اور کینہ بھری آنکھوں کے ساتھ برطانیہ کی ملکہ کے پہلو میں کھڑا تھا۔

برطانوی غلبے کے خلاف جدوجہد کے دوران حالات مختلف تھے۔ اس وقت ہم اپنی اکائی میں خوش تھے۔ ماضی کی غلطیوں کے لیے افہام و تفہیم کے الفاظ کہتے، ماضی کی ہولناکیوں پر خود کو معاف کرتے اور محض اپنے آپ کو دھوکا دیتے۔ ہم نے سڑکوں پر پُرجوش مسرت کے ساتھ جلوس نکالے۔ آنے والی آزادی کے گن گائے۔ آزادی کے نزدیک ہم حب الوطنی کے جذبے سے سرشار تھے۔ مجھے وہ شخص یاد ہے جو سڑکوں پر باجا بجاتا پھر رہا تھا۔ سب بچے قصبے بھر میں اس کے پیچھے گیت گا رہے تھے 'voti mpeni jogoo'۔ اسکول میں مشعل بردار جلوس نکلے تھے، جسمانی ورزش کے مظاہرے، اور کھیلوں کے مقابلے۔ پوری قوم آگے بڑھ رہی تھی، ہم نے ایسے مناظر پہلے نہیں دیکھے تھے۔ فسادات کی پولیس جسے قبل از آزادی عارضی حکومت نے قائم کیا تھا، پریڈ کی مشق کر رہی تھی۔ ملاح کشتی رانی کی دوڑ کے لیے، اپنی کشتیاں صاف کر کے ان پر رنگ کر رہے تھے۔ عوامی بہبود کے شعبے کے کارندے ملبوسات کی پریڈ کے لیے گشتی ٹھیلے سجا رہے تھے۔ مختلف محلے میلے میں شرکت میں اپنی تیاری کو آخری شکل دے رہے تھے۔ بوائے

اسکاؤٹس باہر کیمپ لگا کر ان مہارتوں کی مشق کر رہے تھے جو وہ دکھانے والے تھے۔ اپنے جنگی نعروں کی مشق: کلیبا، کلیبا، یاہو۔ اور اسکول میں ہم سے کہا گیا کہ 'آزادی ہمارے لیے کیا معنی رکھتی ہے' اس موضوع پر ایک مضمون لکھو، ایک جمہوری ریاست!

اب ہم آزاد ہیں۔ ہمارا راہ نما بغیر کسی شرمندگی کے ملکہ برطانیہ کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنی طاقت کے گلے سڑے پھلوں سے چور، موٹا، عیاش، فحش اور راشی فسادی پولیس کی حفاظت میں کھڑا ہے۔ جو اب ٹینکوں اور مشین گنوں سے لیس ایک فوج بن چکی ہے۔ جس کا صرف ایک ہی دشمن ہے۔ اب فوجیوں کو کسی گھر میں گھسنے سے پہلے کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں۔

میں سینما کے پاس تصویریں دیکھنے رک گیا۔ مائی فیئر لیڈی اپنی نمائش کے تیسرے ہفتے میں فل ہاؤس چل رہی تھی۔

میں بہتر ارتکاز کے لیے ایک قدم پیچھے ہٹا، اور عقب میں کھڑے ایک شخص سے ٹکرا گیا۔ معذرت کے الفاظ میں منہ سے نکلنے کے لیے تیار تھے، لیکن میں کہہ نہ سکا۔ اس شخص نے سکون سے واپس میری جانب دیکھا۔ میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا کے نکل گیا۔ اپنے خوف پر میں خود بھی حیران تھا۔ میں نے مڑ کے دیکھا تو وہ شخص اب بھی وہیں کھڑا میری جانب دیکھ رہا تھا۔

مؤذن کی آواز لوگوں کو نماز کے لیے بلا رہی تھی، میں اس کی طرف کھنچ گیا۔ اجتماع کی ضرورت مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں نے پانی کی ٹنکی سے ہاتھ پیر دھوئے۔ کنکریٹ کے حوض کے کنارے نظر کی کہ شاید وہ چیتھڑا ٹوتھ برش اب بھی وہاں موجود ہو۔ پانی کی دھار میرے ہاتھوں سے بہہ کر کیچڑ بھرے گٹر میں مل گیا۔ غسل خانے کے ایک سرے پر بیت الخلا تھا۔ جہاں اندر ایک آدمی بہت زور سے کھانس کر اپنی آبدست کی آواز چھپا رہا تھا۔

وضو کے کلمات میں عادتاً ہی کہہ گیا لیکن میں خود بھی اپنی پاکیزگی کے احساس سے ششدر تھا۔ مسجد کے سکون سے دل کو یہ اطمینان ہو رہا تھا کہ یہاں اس کے ہر درد کا علاج مہیا ہے۔ ذاتی عبادتوں سے ایک اجتماعی بھنبھناہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ پھر سامنے سے ایک شخص اٹھ کر منبر کی جانب بڑھا، جس کا رخ مکّے کی سمت تھا: اس نے ہاتھ فضا میں بلند کیے اور تکبیر کہہ کر ہم سب کی نماز میں امامت کی۔ اختتامِ نماز پر سب نے اپنے برابر کھڑے نمازی سے مصافحہ کیا۔

میں صف میں اپنی جگہ سے اٹھا اور مسجد میں پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں رسول کی مدح میں اجتماعی نعروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

میں پیدل شاہ راہ کیسا تک پہنچ گیا۔ یہی سوچتا رہا کہ ابھی چلتا رہوں یا واپس گھر کی جانب لوٹ جاؤں۔ ایک گھر سے کوئی شخص نمودار ہوا۔ اس نے مجھے محتاط طریقے سے دیکھا پھر ایسے مسکرایا جیسے پہچان گیا ہو۔ وہ ایک پستہ قد، گول مٹول، خوش مزاج آدمی تھا۔ اس کی پتلون اس کی توند سے نیچے لٹک رہی تھی۔

'کیا تم کھو گئے ہو؟' اس نے دریافت کیا

'نہیں' میں نے جواب دیا 'گھر جا رہا ہوں۔'

'تو ایسے سڑکوں پر مت پھرو' اس کی خوش مزاجی میں ہلکا سا اضطراب پوشیدہ تھا۔ 'تمھیں ذرا ڈر نہیں لگ رہا، پاگل ہو گیا؟'

جب میں واپس اودی ریسٹورانٹ کے پاس سے گزرا، تو دروازے کے پاس میز پر بڑے میاں خود موجود تھے۔ مصروف اوقات میں جمعہ اودی خود بھی باورچی خانے میں کام کرتا، پھر شام میں آمدنی گننے کے لیے باہر آ جاتا۔ وہ اپنی کنجوسی کے لیے مشہور تھا، اور اس کے حلیے سے بھی اس بات کو تقویت ملتی تھی۔ وہ دبلا پتلا، چیتھڑے لٹکائے پھرتا۔ اس کی بدنما گلابی جلد والے ہاتھ کھردرے تھے۔ اس کی پوشیدہ دولت اس کے گاہکوں کے درمیان موضوعِ گفتگو رہتی۔

ریسٹورانٹ کے باہر بنچوں پر لوگ مجمع لگائے ریڈیو سن رہے تھے۔ ان میں عالمی حالات کے سنجیدہ پیروکار تھے۔ اپنے گھروں سے نکل کر خبریں سننا ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ وہ خاموشی سے اپنی کافی کے گھونٹ لیتے۔ جب خبریں سنانے والے کی آواز میں انھیں سازش کی بو آتی تو نگاہوں کا تبادلہ کرتے۔ جب خبرنامے کا وقت ختم ہوتا تب وہ حالات کے رخ پر اپنی رائے بیان کرتے۔ جلد ہی یہ گفتگو اس نکتے پر آ گئی جس سے انھیں واقعی غرض تھی: عرب اسرائیلی جنگیں۔

اس امر میں تو بحث کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ اسرائیل نے چھ روزہ جنگ خود سے نہیں جیتی تھی۔ ۔ ایک شخص کا کہنا تھا کہ اسے معلوم ہے ایڈولف ہٹلر اسرائیل کا رئیس ہے۔، اور شاہ حسین نے اسے جنگی منصوبے فروخت کیے تھے۔ عام رائے یہی تھی کہ مصر سینائی میں فتح حاصل

کر رہا ہے۔ اس نے اسرائیل کو ایک چال سے دھوکے میں رکھا ہے، جس میں ان کی پسپائی اسرائیل کو اور اندر کھینچ لے گی۔ پھر عقب سے راستہ بند کر کے اسرائیلیوں کا خاتمہ کر دیا جائے گا۔ فتح عربوں کے قریب آنے لگی تو امریکا مداخلت کر بیٹھا۔ روس جس نے عربوں کی امداد کا وعدہ کیا تھا اس نے کچھ نہ کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ امریکا پر ایٹم بم گراتا، وہ اقوام متحدہ میں تقریریں کرتا رہا۔ اس کہانی کے بہت سے رخ تھے اور بہت مختلف، سخت گیر آرا بھی۔ لیکن اس بات پر اتفاق رائے تھا کہ چھوٹی لڑکیوں کے بڑے پستان ہونے کا سبب یہی بم ہیں۔ میں نے ماں کو برآمدے میں چٹائی پر دراز پایا۔ چراغ کی روشنی میں ان کے چہرے کے خدوخال نرم پڑ گئے تھے، ہڈیاں گوشت سے پُر معلوم ہو رہی تھیں۔ میرے داخلے سے وہ مضطرب ہوئیں اور چونک کے اٹھ گئیں۔

'سب ٹھیک ہے' میں ان کے قریب بیٹھتا ہوا بولا 'سب ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن آپ اندر جائیے، میرے خیال میں بارش ہو ہی جائے گی۔'

وہ آہستگی سی اٹھیں تو درد سے کراہ رہی تھیں، جس کروٹ لیٹی تھیں اس شانے کو سہلانے لگیں۔ انھوں نے جماہی روکنے کی ناکام سی کوشش کی۔ ہوا کی طلب میں انھوں نے منہ کھولا تو چراغ کی روشنی ان کے چہرے پر بدصورت سے سائے پھیلانے لگی۔ میں ان کے عقب میں بیٹھ ان ہی سکھائے طریقے کے مطابق ہاتھ پھیلا کر ان کے شانے دبانے لگا۔ انھوں نے شانے اچکا کے مجھے فارغ کیا، میں سامنے آ کے بیٹھا تو مسکرا دیں 'کہاں تھے تم؟' وہ بولیں 'تمھیں تو اپنے امتحان کے لیے دہرانا چاہیے، اور تم نے تو اب تک رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔'

'گوشت ٹھیک تھا؟ آپ کہہ رہی تھیں کہ اس میں کچھ بساند آ رہی تھی۔'

'اگر سستا گوشت خریدو تو بچت کی بساند ہمیشہ محسوس کی جا سکتی ہے۔ اپنے باپ سے پوچھو مجھ سے نہیں۔'

'میں نے ان سے جانے کی بات کی تھی' میں بولا 'امتحانوں کے بعد۔۔۔'

وہ سنتی رہیں، پھر اثبات میں سر ہلایا۔

'مجھے ابھی اس بارے میں اور غور کرنا ہے' میں بولا 'انھوں نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ

انھیں کیوں جیل کی سزا ہوئی تھی؟'

انھوں نے خوف سے شش کیا، اور انگلی ہونٹوں پر رکھ لی' اتنی زور سے مت بولو۔'

'کیا عمر تھی ان کی؟' میں نے سرگوشی میں پوچھا

کچھ دیر انھوں نے جواب نہیں دیا۔ جب وہ بولیں تو ان کی آنکھوں میں خوف اور احساس جرم جھلک رہا تھا' ان کا قصور نہیں تھا، انھیں تو بس کسی پر الزام رکھنا ہی تھا، وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ میری بات کا یقین کرو۔'

انھوں نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے میں نے کوئی زیادتی کی ہو۔ 'جی' میں نے انھیں تسلی دینے کی خاطر کہا۔

'تم ان کے لیے اس سے بھی بہتر اولاد ثابت ہو سکتے تھے' وہ بولیں 'تم ان کی تھوڑی زیادہ مدد کر سکتے تھے۔'

اس الزام سے مجھے دکھ ہوا۔ مجھے سعید کی تدفین یاد آگئی کہ کیسے میرے والد نے مجھے سعید کی موت پر موردِ الزام ٹھہرایا تھا۔ کوئی مجھے وہاں سے ہٹا لے گیا تھا، مجھ سے شفقت کی گفتگو کی تھی، میری نظروں میں انھیں شرمندہ کیا تھا۔ کون انھیں خود ان کی اولادِ نرینہ کی موت کا الزام دینے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے۔

'شاید' میں نے کہا 'لیکن شاید میں ان کی کوئی مدد کر ہی نہیں سکتا تھا'

'ایسا مت کہو' وہ مجھے دیکھتے ہوئے بولیں

'جب وہ رہا ہوئے تھے تو کیا شراب نوشی اس کے بعد شروع ہوئی تھی؟'

'جو کچھ ہوا تھا، تم نہیں جانتے' آخر وہ بولیں 'ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا تھا۔ جب وہ باہر آئے تو بہت بدل چکے تھے۔ تم اور سعید تو بہت چھوٹے بچے تھے۔ اس زمانے میں انھوں نے شراب نوشی شروع کر دی۔ یہ ان کا قصور نہیں تھا۔ انھیں بہت تکلیف پہنچی تھی، میرا مطلب ہے ان پر بہت تشدد کیا گیا تھا، ان کا دل ٹوٹ گیا تھا۔'

'وہ دوسری عورتوں کے پاس جاتے ہیں، آپ پر ہاتھ اٹھاتے ہیں؟'

انھوں نے آنکھیں بند کر کے ایک گہری سانس لی۔ پھر جھک کر چراغ کی لو کی جانب

متوجہ ہو گئیں۔ روشنی کے سامنے جھکنے سے ان کے چہرے پر دھات کی مانند سختی چمکنے لگی تھی۔

'تم چاہتے ہو تمھارا باپ کسی عفریت کی مانند ہو جائے، ہیں ناں؟ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ انھیں زندگی بہت دشوار لگتی ہے۔ یہ سب ان کی برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ پہلے جیل اور پھر سعید۔'

'لیکن وہ آپ کو مارتے کیوں ہیں۔' میں نے کہا

'تمھارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟' وہ چلائیں۔ 'تم ایسے کیوں ہو گئے ہو؟' انھوں نے مجھے کچھ دیر گھور کے دیکھا اور پھر ایک سانس لے کر مسکرا دیں 'اب ہیرو مت بنو۔ جو میں کہہ رہی ہوں، اس پر توجہ دو۔ میں خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے تم جیسا بیٹا عطا کیا۔ مجھ بڑھیا کی پروا مت کرو۔'

'آپ بوڑھی تو نہیں ہیں۔'

'میں خود کو بوڑھا محسوس کرتی ہوں۔' وہ بولیں

'یہ محض بالوں کی سفیدی ہے' میں نے کہا 'میں آپ کو خضاب لا کر دوں گا، پھر دکھاؤں گا آپ کس قدر نوجوان لگتی ہیں۔'

'ایسی جرأت بھی مت کرنا' وہ ہنستے ہوئے بولیں 'لوگ سمجھیں گے کوئی چاہنے والا تلاش کر لیا ہے' وہ اپنے قدموں پر اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ وہ بڑبڑا کر ان بچوں کو برا بھلا کہتی رہیں جو رات گئے تک سڑکوں پر گھومتے ہیں، جیسے ان کا کوئی گھر نہ ہو۔ مجھے 'بچے' کا استعارہ پسند نہیں آیا لیکن میں نے درگزر کیا۔ وہ اس چھوٹی سی کوٹھری میں گئیں جو ہمارے نعمت خانے کا کام دیتی تھی، اور پتیلی اٹھا لائیں جس میں کیلے کی باقیات پڑی تھیں۔

'یہ لوگ بہت شور مچا رہے ہیں' وہ بولیں۔ بڈھے کے چٹکلے سے نشے میں دھت آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی شہنائی کی آواز، تو کوئی پاگلوں کی طرح ہنس رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کیلوں کے خشک انبار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کچھ دیر مجھے حیرت سے اسے نگلنے کی کوشش کرتے دیکھتی رہیں 'پانی کا گھونٹ پی لو اس سے پہلے کہ حلق میں پھنس جائے' وہ بولیں۔

میں نے نلکے کے پاس جا کر چلو میں پانی بھرا اور پی لیا۔ مجھے بھاری پن معدے میں

اترتا ہوا محسوس ہوا۔ میں کسی فریضے کی طرح دوبارہ پتیلی کی جانب لوٹ گیا۔ ہوا اچانک تیز ہوئی تو چراغ بجھ گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھوں نے بھی سر اٹھا کے اوپر کی جانب دیکھا ہے

'آج رات بارش ہوگی' وہ بولیں

'ہاں' میں نے کہا

'اللہ رحم کرے'

جب میں مزید نہ کھا سکا تو انھوں نے پتیلی اٹھا لی۔ انھوں نے اس میں پانی بھر کے اسے رات بھر کے لیے چھوڑ دیا۔ 'تو تمھارا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟' انھوں نے واپس آکر پوچھا

'میں پڑھنا چاہتا ہوں،،، لیکن مسئلہ پیسوں کا ہے' تاریکی میں اچانک کہیں سے بھونکنے کی آواز ابھری اور ایک کتا بھاگ کر صحن سے گزرا اور تاریکی میں گم ہوگیا۔ 'شاید بہتر یہ ہو کہ میں کوئی نوکری ڈھونڈ لوں؟'

'میرے خیال میں ہم پیسوں کا انتظام کرلیں گے' وہ بولیں 'بہ شرط یہ کہ تمھیں اپنے ارادوں پر یقین ہو'

'ہاں میری ماں' میں ان کی جانب مسکرایا۔ میں ان کی مادرانہ رجائیت پسندی کو کوئی دھچکا نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ ارادہ ہو تو راستہ نکل ہی آتا ہے، اور اسی قسم کی دوسری حماقت آمیز باتیں وغیرہ۔ وہ ایسے ہنسیں جیسے میرے خیالات پڑھ رہی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے وہ واقعی بہت خوش نظر آئیں۔

'نیروبی والے تمھارے ماموں، میرا بھائی احمد' وہ بولیں 'ان سے رابطہ کریں گے۔ وہ اب ایک متمول آدمی ہے۔ تم ان کا خون ہو۔ انھیں ضرور تمھاری مدد کرنی چاہیے۔'

'مذاق کر رہی ہیں' میں ان سے کسی معجزے کی امید تو نہیں کر رہا تھا، لیکن ذرا سا مایوس ہوا کہ وہ ماموں احمد تک ہی سوچ سکیں۔

'کون مذاق کر رہا ہے؟' انھوں نے ہنستے ہوئے سوال کیا 'وہ میرا مقروض ہے۔ جب ہمارے والد کا انتقال ہوا تھا، تو تمھارے ماموں نے دکان اور بزنس سب بیچ کر سارے پیسے خود رکھ لیے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر کبھی بھی پیسوں کی ضرورت پڑے تو اس سے

رابطہ کروں۔ اس نے میرے حصے پر ڈاکا ڈال کر خود کو مال دار کیا ہے تو اب ہم اس سے واپس لیں گے۔'

'آپ کیسے واپس لیں گی، چوری کریں گی؟'

'کر تو سکتے ہیں' وہ اب بھی ہنس رہی تھیں 'خیر کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔ تمھیں کیا مسئلہ ہے، ایک امکان تو ہے۔'

'اماں، کیسا امکان ۔ انھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ زندہ ہیں، وہ کبھی آپ کو لکھتے نہیں، رابطہ نہیں کرتے۔'

'امکان تو ہے' انھوں نے ضد کی 'تم یقیناً نیروبی جا کر ان سے ملو۔ میں تمھارے ابا سے کہوں گی کہ انھیں خط لکھ کر مطلع کریں۔ وہ مشکلات تو پیدا کریں گے، میرا مطلب ہے تمھارے ابا، لیکن پھر لکھ دیں گے۔ پھر تم نیروبی چلے جانا۔۔۔'

'اور ماموں احمد میری جانب کھنچے آئیں گے'

وہ ہنسی سے دُہری ہو گئیں 'وہ یقیناً تمھیں پسند کرے گا۔ میں احمد کو جانتی ہوں ۔ وہ ایسے لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس سے نظریں ملا کے اپنی ضرورت بیان کر سکیں۔'

'میں اپنی ماں کا حصہ لینے آیا ہوں!' میں نے لقمہ دیا

انھوں نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا 'سو جاؤ اب۔ میں کل تمھارے ابا سے بات کروں گی۔ تم اس درمیان خوب پڑھو اور امتحان میں کامیابی حاصل کرو ۔ ہر رات جب تم غائب ہو جاتے ہو اور میں پوچھتی ہوں کہ کہاں تھے تو تم کہتے ہو ایسے ہی چہل قدمی کو گیا تھا۔ کسی دن کسی حاملہ لڑکی کو گھر لا رہے ہو گے۔'

'ہاں میری ماں' میں جیسے کوئی پہاڑی بکرا۔ تاریکی میں، میں نے محسوس کیا کہ وہ چٹائی پر لیٹ گئی ہیں، میرے باپ کے انتظار میں۔

میں برآمدے میں ایک گدّے پر سو گیا۔ دن کے وقت روئی کا یہ بنڈل لپیٹ کر کھانے کی الماری کے نیچے رکھ دیا جاتا۔ رات کو میں اسے باہر نکالتا۔ وہ چیتھڑا اس پر بچھاتا جسے ہم چادر کہتے تھے، اور اس پر دراز ہو جاتا۔ میں نے کروٹ بدلی تاکہ برآمدے میں لگے بجلی کے

بلب کی روشنی میں پڑھ سکوں۔ گھر کے تین کمروں میں بجلی لگ گئی تھی۔ لیکن اگر کوئی مہمان نہ آیا ہوا ہو تو ہمیں صرف کم زور بلب استعمال کرنے کی اجازت تھی۔ میرے چاروں طرف غربت کی نشانیاں بکھری تھیں۔ فرش پر گڑھے پڑ گئے تھے، کنکریٹ اکھڑ گئی تھی۔ سفیدی ہوئی دیواروں پر تیل کے دھبے تھے۔ کھانے کی الماری میں کاک روچ مقیم تھے۔ جورات کو باہر نکل کے آزادی سے غذا کی تلاش میں گھر اور صحن میں دوڑتے پھرتے۔ مجھے یہ خوف بیدار رکھتا کہ ایک دن ان کے پنجوں کے کھرونچے اپنے چہرے پر محسوس کر کے بیدار ہوں گا۔ میں برسوں سے اسی گندگی میں رہتا رہا ہوں۔ لیکن اب چھوٹا سا کام کرتے ہوئے بھی سوچنا پڑتا تھا۔ اب مجھے اپنے آپ کو غسل خانے جانے پر آمادہ کرنا پڑتا تھا، جہاں فرش پر ہرے کیچڑ کی تہہ بچھی ہوئی تھی۔ رسوئی کی دیواروں میں کالی پھپھوند لگی تھی۔ اور چھت کے شہتیروں کے ساتھ مکڑی کے پرانے جالوں کے تار غلاظت کے لچھوں کی مانند دوڑ رہے تھے۔ ذکیہ ہمیشہ تلخی سے اس گندگی کا شکوہ کرتی لیکن میری ماں کی اس تنبیہ کو کہ اسے صاف کرلو نظر انداز کر دیتی۔ ہم میں سے کوئی بھی اس ضمن میں کچھ نہیں کرتا تھا۔

پہلے تو میں یہ ہی سمجھا کہ شاید خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن میرے شانے پر برسنے والے گھونسے اصلی تھے۔ نیند کی مدہوشی سے بیداری کا سفر ایک سست عمل تھا۔

'باہر آؤ' ماں کی سرگوشی سنائی دی

میں ان کے تعاقب میں باہر نکلا، مجھے یقین تھا کہ والد سے متعلق ہی کوئی مسئلہ ہوگا۔ گلی سے بلب کی مدہم روشنی صحن تک آرہی تھی۔ اتنی روشن بھی نہیں کہ ہر شے صاف نظر آجائے لیکن اتنی ضرور کہ تاریکی کے سیاہ لبادے کو اور مہین کردے۔ تاریکی میں کوئی شخص کھانسا تو میں بوکھلا گیا۔ میری ماں چراغ کی لو تیز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آخر انھوں نے ایک دیا سلائی جلائی تو اس کے شعلے کی روشنی میں ان کے جھکے ہوئے جسم کا ہیولا نمایاں ہوگیا، اور ان کے اطراف کچھ روشنی پھیل گئی۔

'کون ہے؟' میں نے پکار کے دریافت کیا۔ میں نے اپنی آواز سے ڈانٹ ڈپٹ کا عنصر نکال دیا تھا، کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ یہ میرے والد ہی ہیں جو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار

رہے ہیں۔ جواب میں وہاں سے صرف گھگھیانے کی آواز ہی سنائی دی۔۔

'روشنی میں آؤ' میری ماں کی آواز لرز رہی تھی۔

اس شخص نے ایک آہ بھری لیکن ہلا نہیں۔ میری ماں چراغ اس کے نزدیک لے گئی تو انھوں نے دیکھا کہ وہ خامیس تھا، میرے والد کا ایک رفیق۔ وہ مکان کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھا، ایک پاؤں صحن میں اور دوسرا گلی میں۔ اس نے دیوار کا سہارا چھوڑنے کی کوشش کی مگر جلد ہی مایوس ہو کے یہ ارادہ ترک کر دیا 'میرے ساتھ آؤ فوراً' وہ بولا۔

اس نے آنکھیں موند لیں، وہ مزید کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے واپس جا کر کچھ کپڑے پہنے اور ایسے ہی جلدی میں نیم ملبوس باہر نکل گیا۔ خامیس یوں زمیں بوس تھا کہ اس کا سر مکان کے کونے کے پیچھے اوجھل ہو گیا تھا۔

'اس نے کچھ بتایا کہ وہ کہاں ہیں؟' میں نے ماں سے پوچھا

انھوں نے شانے اچکا کے خامیس کی سمت اشارہ کیا، اسی سے پوچھو۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن چہرے پر بے جان سی مسکراہٹ تھی۔ وہ منحنی سا آدمی تھا اور اسے گھسیٹ کر کھڑا کرنا دشوار نہیں تھا۔ وہ یوں بے جان سا کھڑا ہو گیا تو میری سمجھ میں آیا کہ بعض اوقات ایسی حالت میں لوگوں کی پٹائی کرنے کا کیوں دل چاہتا ہے۔ اس کے پاس سے کسی سڑی ہوئی باسی شے کی بدبو آ رہی تھی۔ مجھے پہچان کر اس نے خوشی سے کلکاری ماری۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ میرے سامنے جھوم رہا تھا۔

'کہاں ہیں وہ؟' میں نے پوچھا

اس نے ایسے سر ہلایا جیسے میری بات سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہا ہو۔ 'وہ وہاں ہنگامہ کر رہے ہیں' وہ بدقت بولا، جیسے اس کے منہ میں کچھ بھرا ہوا ہو۔ 'وہ لڑنا چاہتے ہیں، مگر بہت مار کھائیں گے، بالکل مدہوش ہیں۔' اس نے آخری الفاظ انتہائی نفرت سے ادا کیے، پھر بے موقع ہنس کے ماتھے پر ہاتھ مارا جیسے اس سارے قصے کی حماقت پر حیران ہو۔ پھر سر ہلا کے اس نے رونا شروع کر دیا۔ میری ماں نے مجھے ایک طرف ہٹایا اور خامیس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا۔ میں نے انھیں واپس ہٹایا، اب وہ بچوں کی طرح بلک رہا تھا۔

'وہ کہاں ہیں؟' میں نے ایک بار پھر دریافت کیا، میں اسے اپنے سامنے اس کے شانوں سے تھام لیا کہ گریے کے ساتھ اس کا ہلنا بند ہو

'السود کے پاس' روتے ہوئے اس کی آواز بچوں کی مانند باریک ہوگئی تھی

'میں جاتا ہوں' میں نے ماں سے کہا۔ ان کا چہرا غصے سے کرخت ہوگیا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے وہ منتظر تھیں کہ میں کوئی شکوہ کروں گا یا نخرہ دکھاؤں گا۔

'تمھیں معلوم ہے اس وقت کیا بجا ہے، کل تمھارا امتحان ہے؟'

'ہاں معلوم ہے، لیکن مجھے جانا ہوگا۔'

میں نے خامیس کو دیوار سے ہٹانے کی کوشش کی تو اس نے کراہ کے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ لیکن پھر میری ماں کے ہاتھ میں ایک جلتی ہوئی لکڑی دیکھ کر اس نے ہٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ دبکتا جھکتا میرے آگے چلنے لگا۔ میدان کے پاس میں اس سے آگے نکل گیا۔ جب وہ سمجھا کہ میں کیا کررہا ہوں تو وہ سکون کا سانس لے کر وہیں بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ دیکھوں شاید اس کے پاس کچھ رقم ہو۔ میں نے مدہوش نشہ بازوں کے پاس پھولے ہوئے بٹوں کی کہانیاں سن رکھی تھیں۔ خامیس نے بغیر کسی اطلاع کے بلند آواز سے ریاح خارج کی، جتنی دیر میں وہ اپنے عمل کو دہراتا میں تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

یہ ایک تاریک رات تھی، پرُخوف سناٹے کا راج تھا۔ فضا بوجھل تھی اور ہوا میں ترشی تھی۔ بارش شروع ہوگئی تھی، لیکن غیر مسلسل، گھبراہٹ کی ماری بارش۔ اب کسی بھی وقت آسمان کھل کر برسنے والا تھا۔ میں ساحل کے قریب پہنچ کر پرانے پتھریلے راستے پر گودی کی جانب بڑھنے لگا۔ سمندر کے شور میں میرے قدموں کی ڈراونی آواز دب گئی تھی۔ میں ٹوکریوں اور بوریوں کے ڈھیر کے پاس سے گزرا، جہاں ہم نے بچپن میں چھپن چھپائی کھیلی تھی۔

راستہ جنگلے کو چھوڑ کر اس جانب چلا گیا تھا جہاں رات کے سناٹے میں بڑے، خاموش گودام کھڑے تھے۔ گوداموں کے بعد آم کے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ ان دونوں کی درمیانی جگہ میں ایک پرانی نیچی سی عمارت تھی، جس کے اطراف ہر سمت سے لایا ہوا کباڑ ڈھیر تھا۔ یہ سودائی جگہ تھی، گندی اور بدنام۔ قانون اسے محض اس لیے برداشت کرتا کہ یہاں جمع ہونے

والے لوگ پہلے ہی حالات کے ہاتھوں شکست خوردہ تھے۔

دو آدمی سیڑھیوں پر نیم دراز تھے۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ ذرا چوکنے ہو گئے۔ میں ذرا نزدیک پہنچا تو وہ دوبارہ ڈھیلے پڑ گئے، مسکرانے لگے۔ میں سیڑھیوں سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ ان میں سے ایک جس کی قمیض کے بٹن ناف تک کھلے تھے، آگے بڑھ آیا۔ دوسرا ذرا بڑی عمر کا تھا، وہ دیوار سے ٹیک لگائے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ وہ دونوں سخت گیر اور ناپسندیدہ افراد تھے، جنھیں عمر بھر کی تنگ دستی نے کھردرا کر دیا تھا۔ جو شخص آگے آیا تھا اس نے اپنا منہ اٹھایا تو اس کی تھوڑی میری سمت میں بلند ہو گئی۔

'میں اپنے والد کو لینے آیا ہوں' میں نے بہت انکسار سے کہا 'میرے خیال میں وہ وہاں ہیں۔'

وہ دونوں ہنس پڑے۔ شاید انھیں میری بات بچکانہ لگی ہو۔ بوڑھا آدمی تیزی سے سیڑھیاں اتر آیا تو میں ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ میرے پاؤں فرار کے لیے تیار تھے، دل زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ اچانک اپنے راستے میں ہی ٹھٹک گیا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے دونوں ہاتھ مکے بنا کر بلند کر لیے ہیں۔ وہ میری مٹھیاں دیکھ کر مسکرایا، ایک ہاتھ سے انھیں ہٹایا:

'تم فوراً گھر جا کر اپنی مقعد میں اغلام بازی کراؤ، اس سے پہلے کہ میں تمھارا آلہ کاٹ کر تمھارے منہ میں گھسیڑ دوں' وہ بولا

'دفعہ بھی ہو چکو حرامی، سور، اس سے پہلے کہ میرا ارادہ بدل جائے۔'

میں نے ایسے آہستگی سے اپنے ہاتھ نیچے کیے جیسے یہ رعایت دینے کے لیے میں بہت اندرونی کش مکش میں مبتلا ہوں۔ نوجوان نے قہقہہ لگایا اور اپنے ساتھی کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میرے پاؤں پہ لرزہ طاری ہو گیا۔ نوجوان اپنے ساتھی کو مغلظات سنانے لگا، اسے گوں خور اور آدم خور پکارنے لگا۔ 'یہ یہاں اپنے باپ کو لینے آیا ہے' وہ بولا 'تمھیں کیا معلوم اس بات کی کیا اہمیت ہے۔ تمھارا تو کوئی باپ تھا ہی نہیں، اس لڑکے کو تنہا چھوڑ دو۔'

اچانک وہ مجھے ایک شریف آدمی لگا۔ ایک معزز غنڈہ۔ 'اندر کوئی نہیں ہے' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ 'وہ یقیناً وہاں کباڑ میں ہوگا۔ اب یہاں سے دفع ہو چکو۔'

اس نے آنکھ دبا کے اپنا سر ہلایا۔ میں نے کوشش کی کہ پرانی کار سیٹوں اور ٹوٹے بستروں کے درمیان کسی انسانی ہئیت کو تلاش کروں۔ روشنی اتنی ضرور تھی کہ دیکھا جا سکے لیکن سایوں کی وجہ سے منظر الجھ گیا تھا۔ میں نے انھیں ایک ڈبا پر رکھی پشت دار لمبی نشست پر لیٹے دیکھا، نشست کے گدے کی بھرائی غائب ہو چکی تھی۔

پہلے میں سمجھا کہ وہ شاید زخمی ہیں، ان کے پاؤں ناممکن زاویوں میں خم تھے۔نشست کا ہتھا ان کے چہرے کو روشنی سے محروم کر رہا تھا۔ میں نے جھجکتے ہوئے ان کا شانہ ہلایا، لیکن وہ نہیں ہلے۔ وہ اب بھی اپنی جیکٹ میں ملبوس تھے۔ان کی چہل قدمی کی چھڑی نشست سے ٹیک لگائے ایسے کھڑی تھی، جیسے احتیاط سے وہاں رکھی گئی ہو۔۔اب میں نے انھیں جھنجھوڑ کر اٹھانا چاہا۔'میری مقعد سے جفتی کر لو' وہ چیخے اور ہاتھ، پیر چلانے لگے۔ میں نے آگے بڑھ کے پوری قوت سے انھیں ایک طمانچہ مارا۔ مجھے اس احساس سے یقیناً ایک کمینی سی خوشی ہوئی کہ میں ان کے بے حس جسم کو تکلیف پہنچا رہا تھا۔ میں نے انھیں پھر تھپڑ مارا۔ مجھے اس سے جو خوشی ہوئی اس پر میں خود سے شرمندہ بھی ہوا۔ وہ کراہے

'اٹھیں' میں چیخا 'گھر جانے کا وقت ہو گیا ہے۔'

میں نے انھیں زور سے جھنجھوڑا۔ وہ پھر ہاتھ، پاؤں چلانے لگے، اس دفعہ ان کا ایک گھونسا میرے سینے تک بھی پہنچ گیا۔ پھر انھوں نے مجھے پہچان لیا۔ وہ بیٹھنے کی کوشش کرنے لگے، جیسے مجھ سے اپنی شراب نوشی چھپانا چاہ رہے ہوں۔ پھر وہ ایک کراہ کے ساتھ واپس دراز ہو گئے۔ میری جانب مذاق اڑانے والے انداز میں دیکھا۔ 'دیکھ رہے ہو میرا کیا حال ہے' وہ مبہم سے انداز میں بڑبڑائے۔

میرے عقب میں کچھ آواز ہوئی تو میں نے مڑ کے دیکھا۔ ایک آدمی الٹے ہوئے اسٹیل کے ڈرم میں سے رینگتا ہوا نکلا۔ اس کے پاس سے پیشاب کی بو آ رہی تھی 'میں بہت مضبوط آدمی ہوں' وہ چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتے ہوئے بولا۔

'میں نے کئی مرتبہ اس کی مقعد سے جفتی کھیلی' میرے والد بولے اور اپنے آلہ تناسل سے اس کی جانب اشارہ کیا 'یہ سڑک پر لیٹ جاتا ہے اور بچے اس سے جفتی کھیلتے ہیں'

وہ آدمی سڑک پر سیدھا لیٹ کر رفتہ، رفتہ نیند کی وادی میں اتر گیا۔ میرے والد نے آگے بڑھ کر اس پر تھوک دیا، لیکن اس سے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ آدمی دبی، دبی ہنسی کے ساتھ کروٹ کے بل لیٹ گیا، لیکن اب اچانک وہ بہت غیر محفوظ نظر آنے لگا۔ میرے والد نے بھی اسے محسوس کیا اور چھڑی پر گرفت مضبوط کر کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ ان کے گرد حمائل کر کے گویا اس آدمی سے اوجھل کر دیا۔ ان کا لمس بہت کراہت انگیز، ڈھیلا اور بے جان سا تھا۔ انھوں نے ہمارا رخ اس شخص کی سمت پھیرا جو اب گہری نیند سو رہا تھا۔ اچانک ایک غیر متوقع قوت سے میرے والد آگے بڑھے اور اس شخص کی پشت پر اپنی چھل قدمی کی چھڑی ماری۔ میں نے انھیں چھوڑ دیا۔ انھوں نے بمشکل اپنے توازن پر قابو پایا۔ پھر اچانک ایک گہری سانس بھری اور قے کر دی۔ میں نے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کیا۔ منتظر رہا کہ وہ کراہنا بند کریں اور اپنے آپ کو صاف کر لیں۔ لیکن جب مجھے لگا کہ وہ دوبارہ سونے کی تیاری کر رہے ہیں تو میں دوبارہ ان کی جانب بڑھا۔ میں نے بمشکل انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ اب ہمیں چل دینا چاہیے۔ ہم بہت سست رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ جب ہم میدان عبور کر رہے تھے تو بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو صرف موٹے اور بھاری قطرے تھے جو جلد پر چھپ سے آ کے گرتے تھے۔ قطروں کے حجم سے یہ بات واضح تھی کہ یہ موسلا دھار بارش کی ابتدا تھی۔ بارش ہر قدم پر تیز تر ہو رہی تھی۔ ہمارے قدموں پہ کیچڑ مل رہی تھی۔ جلد ہی ہمارے سروں پہ بارش غضب ناکی سے برسنے لگی، اس کا متشددانہ رویہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم نے ایک گودام میں پناہ لی۔ پانی کی چادریں ہماری اس مختصر پناہ گاہ کو ہر طرف سے گھیر رہی تھیں، بغیر نالیوں کی چھت سے جھڑی لگی تھی۔ میں اپنے والد کی بھاری سانسیں بہت قریب محسوس کر رہا تھا۔

'زرعی علاقوں میں لوگ جشن منا رہے ہوں گے' میں نے ان سے کہا 'کیا یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ آپ کو بھی کوئی دل چسپی ہوگی، کیا آپ کو کوئی فرق پڑتا ہے؟'

'بھاگو، جفتی کھیلو' وہ بڑبڑائے

میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کے ان کا بازو ڈھونڈ لیا۔ اسے کھینچا اور ہم دوبارہ

چل پڑے۔ وہ بغیر کسی احتجاج کے ساتھ آ گئے۔ پانی کی دھاریں جلد پر برے کی مانند برس رہی تھیں۔ میں نے ان کا بازو اپنی گرفت سے پھسلتا محسوس کیا تو تیزی سے گھوما لیکن میں انھیں کھو چکا تھا 'بے وقوف، بدمعاش میں امتحان میں فیل ہو جاؤں گا'۔ آگے کسٹم کی چنگی تھی، اور اسکے دونوں جانب لگی بتیاں زمین پر روشنی منعکس کر رہی تھیں۔ اس امید پر کہ وہ بارش کے شور میں بھی آواز سن لیں گے میں نے زور سے پکارا۔ 'ابا، کہاں ہو، ابا؟'۔ جواب میں ایک گانے کی آواز ابھری یا شاید کوئی مسرت بھری چیخ تھی۔ میں روشنی کی جانب بھاگا لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ کباڑ میں پڑے کسی زنگ آلود پنجر سے نہ ٹکرا جاؤں۔ مجھے وہ تار وقت پر نظر آ گیا تو میں نے ہاتھ بڑھا کے اپنی تیز رفتاری کو لگام دی۔ میرے عقب سے ایک کراہ بلند ہوئی تو میں نے چیخ کر اپنی جگہ کا اعلان کیا۔ میں نے انھیں دیکھا تو وہ ہنس رہے تھے، ہاتھ پھیلا کر اس پانی کو گلے لگا رہے تھے جو چاروں سمت سے ہمیں گھیرے ہوئے تھا۔ میں نے ان کا شانہ پکڑ کے انھیں اپنی جانب کھینچا۔ وہ سرگوشی میں کچھ آیتیں پڑھ رہے تھے، مجھ سے لپٹ گئے۔

اب راستہ بہت پھسلن تھا اور ہمیں احتیاط سے قدم آگے بڑھانے پڑ رہے تھے، آخر ہم پکی سڑک پر آ گئے۔ منعکس روشنی آگے آگے ہمیں راستہ دکھا رہی تھی۔ میرے والد روشنی کی شعاؤں میں جھلملاتی بارش میں محو تھے۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا، انھیں اکسایا کہ وہ بھی پیچھے آئیں، لیکن انھوں نے آواز دی کہ میں آہستہ ہو جاؤں 'یہ تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی' وہ چلائے۔ اس امید میں کہ ان کے قدم بڑھتے رہیں گے میں ان کے آگے چلتا رہا۔ اکثر پیچھے جا کر انھیں جلد قدم اٹھانے کی تاکید کرنی پڑتی۔ بارش نے ان کا ذہن پھر بیدار کر دیا تھا۔ اب وہ سفر کے آغاز جتنا لڑکھڑا رہے تھے اور نہ ہی گر رہے تھے۔ انھوں نے الٹے قدموں چلتے ہوئے ایک بار پھر روشنی پر نگاہ کی۔ اور بہت سکون سے ڈھیر ہو گئے جیسے بہت احتیاط سے بستر پر لیٹ رہے ہوں۔ وہ ہنستے، تالی بجاتے پانی کے گڑھے میں پڑے رہے۔

'بہت دنوں کی بات ہے' وہ گانے لگے۔ ان کی آواز بھاری اور گمبھیر ہو گئی، جیسے کوئی پرانے زمانے کا شیخ تجوید سے پڑھ رہا ہو۔ 'جب میں ایک چھوٹا بچہ تھا، سمندروں میں کشتی

جاتا تا، اپنے رزق کی تلاش میں، ہمارا جہاز پتھر یلے ساحل نے ڈبو دیا، اور ہم سکوترا کی زمین تک تیر کے پہنچ گئے، وہاں بادشاہ نے ہمیں قید کرلیا۔۔۔۔'

'آپ کہیں گئے ہی نہیں تھے کہ ڈوبتے' میں نے جھک کے انھیں اپنے بازو کا سہارا دیا۔

انھوں نے کچھ دیر میری جانب دیکھا۔ وہ اب بھی ہنستے ہوئے آنکھوں سے بارش کا پانی پونچھ رہے تھے 'ایک دفعہ کا ذکر ہے' وہ اپنی انگلی خطیبانہ انداز میں گھمانے لگے 'میں ایک باعزت شخص تھا، تمھیں معلوم ہے کیا ہوا تھا؟'

'چلیے اب گھر چلیں' میں بولا 'آئیے بڑے میاں، صبح میرا امتحان ہے۔'

'انھیں تمھارے بارے میں معلوم ہے' وہ آہستگی سے بولے ''میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ تم فرار کے لیے پر تول رہے ہو' میں انھیں اٹھانے کی کوشش کررہا تھا، وہ میرا بازو پکڑے رہے۔ 'غدار، دغاباز' وہ مجھ پر چلائے۔ ہم ساحل کے ساتھ خاموشی سے چلتے رہے، صرف ایک بار رکے تاکہ وہ پیشاب کرلیں۔ ہم گھر کے نزدیک پہنچ گئے تھے جب وہ میرے برابر آکر میرے بازو پر جھول گئے۔

'تمھارے لیے سب سے بہتر جگہ یہی ہے' انھوں نے سرگوشی کی 'میں نے سب کو بتا دیا ہے کہ تم بھاگنے والے ہو۔ وہ تمھیں قید کردیں گے۔ تم جفتی باز، دغاباز۔ تم ہم سب سے بہتر ہو، یہ تو ہر ایک دیکھ سکتا ہے۔ وہ تمھیں قید میں ڈال دیں گے۔'

'اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' میرا مطلب یہ تھا کہ پاسپورٹ کے لیے دی جانے والی درخواست سے انتظامیہ خبردار ہو ہی گئی تھی

'میرے عزیز بیٹے، میرے بہادر، عقل مند' انھوں نے اونچے سروں میں مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ 'کیا بیٹا ہے، جو کسی چیز سے خوف زدہ نہیں۔ جو اپنی ماں، اپنے باپ، اپنے لوگوں، اپنے خدا سب سے نفرت کرتا ہے' مجھے ان کے چہرے پر نفرت لکھی نظر آرہی تھی۔ ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اب ہم کھلے میدان میں مازمبارو کے درخت کے نیچے کھڑے تھے۔ بارش ہلکی ہونا شروع ہوگئی تھی۔ وہ میرا بازو چھوڑ کے میدان

عبور کرنے لگے۔ وہ بڈھے آدمی کے چھلکے کے سامنے رکے اور ایک بہت بڑی رس بھری اس پر دے ماری۔ انھوں نے انتظار کیا کہ میں ان کے برابر پہنچ جاؤں اور پھر مجھے آگے نکل جانے دیا۔ انھوں نے میری پشت پر چھڑی سے ٹھوکا دیا، ایک بار، دوسری بار۔ میں نے انھیں گلی میں پہلے داخل ہونے دیا۔ وہ پھسلے تو ان کے منہ سے گالی نکل گئی۔ میں نیم اوندھے جسم کو پھلانگ کر صحن میں داخل ہو گیا۔

میں نے باہر ہی سے کپڑے اتارنے شروع کر دیے تھے۔ وہ موڑ پر نظر آئے۔ تاریکی میں ان کا ہیولا جھوم کے منڈلا رہا تھا۔ ماں دروازے پر آ گئی۔ اس نے ایک چراغ سر سے بلند کر رکھا تھا۔ انھوں نے پہلے مجھے دیکھا۔ میرے نیم برہنہ شرابور جسم پر اوپر سے نیچے تک نگاہ ڈالی۔ میں ان کی ٹٹولتی نظروں کے جواب میں مسکرایا تو اس سے انھیں کچھ اطمینان ہوا، کیوں کہ انھوں نے سر ہلا کے چراغ کا رخ میرے والد کی سمت پھیر دیا۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور کپڑے مٹی سے سنے ہوئے تھے۔ انھوں نے چراغ دروازے کے پاس زمین پر رکھا اور واپس اندر چلی گئیں۔ وہ لڑکھڑاتے، دبے دبے قہقہوں کے ساتھ بڑبڑاتے ان کے پیچھے چلے گئے۔

31-07-2023, 11:42 pm

(۳)

امتحان کے دن تو کسی دھند لکے کی مانند گزر گئے۔ ہم سب ہی اسے اپنی خواری کی انتہا سمجھتے تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ یہ ہمارے خوابوں کی سرحد تھی، بلکہ اس لیے بھی کہ ہم سب کے خیال میں ہماری حیثیت کا تعین ان امتحانات کے حوالے سے ہی ہوگا۔ ہر چیز نے سازش کرکے ہمیں اس مضحکہ خیز صورتِ حال تک پہنچا دیا تھا۔ اس وقت کے ہم ہی ہیرو تھے۔ زندگی اور ذہانت کے امتحانات سے نبرد آزما ہوتے، جیسے کسی غیر متوازن شخص سے مقابلہ کرتے جو ہر موڑ پر ہمیں دھوکا دیتا اور شب خون مارتا۔ ہر پرچے کے بعد ہم سب امتحان ہال سے ایک گروہ کی صورت باہر نکلتے، جیسے جنگ سے لوٹتے گوریلے سپاہی، سڑکوں پر مٹرگشت کرتے، ممتحنوں کی چالاکی سے خوش دلی سے بچ کر نکل آنے والے لوگ۔ ہم اپنے تئیں ایک اہم گروہ تھے جو سڑک کے کنارے مسائل پر مباحثہ کرتے: اس کا درست جواب رسوب کسلی ہے یا کلسی رسوب۔ کوئی ہم پر نہیں ہنستا تھا، بلکہ ہمارے ارتکاز پر ہمارے اساتذہ بناوٹی مسرت کا اظہار کرتے۔ ہم سب ہی واقف تھے کہ ہم سے پہلے کامیاب ہونے والے طلبہ کن فضائل سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

تو ان امور کی طاقت پر ہمارا اعتقاد تقریباً ایک عادت بن گیا تھا۔ امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی افواہیں گردش کرنے لگی تھیں کہ ان کے نتائج کا کبھی اعلان نہیں کیا جائے گا۔ حکومت

خوف زدہ ہے کہ کامیاب ہونے والے طلبہ یہاں سے نکل جائیں گے۔ پہلے ہی اتنے لوگ جا رہے ہیں کہ اساتذہ اور قلم کاروں کی سنجیدہ کمی واقع ہو جائے گی۔ افواہ تھی کہ صرف ان کو نتیجہ دیا جائے گا جو ایک نئی دو سالہ قومی سروس انجام دیں گے۔ ان خبروں کے پس منظر میں امتحانی سرگرمی میں میری دل چسپی جان دار لیکن واجبی سی تھی۔ یہ سب اسی بے یقینی اور انتقام کی سیاست کی عمومی سیاسی فضا کا ایک حصہ تھا، جو آزادی ہمارے لیے لے کر آئی تھی۔

جب امتحان کا بوجھ اترنے کا خمار ختم ہوا اور انتظار کے ہفتے مہینوں میں بدل گئے تب ہمیں اپنی محرومی کا احساس ہوا۔ ابتدا میں چند طلبہ کو حکومتی وزارات میں طلب کیا جاتا، اور انھیں کم تنخواہ پر کلرک کی نوکری پیش کی جاتی۔ مجھ کو وزارتِ تعلیم میں بلا کر نائب استاد کے طور پر بنا تنخواہ کام کرنے کی پیشکش کی گئی، ساتھ میں ذاتی اخراجات اٹھانے اور نتیجہ نکلنے کے بعد باہر جانے کے لیے اسکالرشپ کا وعدہ بھی۔ باقی سب کو مشورہ دیا گیا کہ فوج میں شامل ہو جائیں۔ میں نے امیگریشن کے دفتر جا کر اپنے پاسپورٹ کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ محض وقت گزاری کا طریقہ تھا۔ میں قطار میں کھڑا ہو کر گھنٹوں سرکتا کاؤنٹر کی جانب بڑھتا، جہاں بغیر کسی فائل سے رجوع کیے افسر مجھے بتا دیتا کہ ابھی کچھ نہیں ہوا۔

انتظار کے ان لمبے مہینوں میں میرے والد نے اکثر مجھ سے گفتگو کی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس رات ان کے ساتھ گھر آنے سے ان کے لیے بے تکلف ہونا نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ انھوں نے ماموں کو ایک خط لکھا، ایک بڑے آدمی کو ایک طویل شکایتی خط۔ انھوں نے بھیجنے سے پہلے خط کئی بار مجھے سنایا، اور کئی مقامات پر اپنی عقل مندی کی نشان دہی بھی کی۔ انھوں نے اسے بہت روانی سے پڑھا، آواز کے زیر و بم اور ہاتھوں کے اشارے سے اس میں وہ قوت پیدا کر دی جو کاغذ پر مفقود تھی۔ انھوں نے ماموں کو اپنی بہن سے کیا وعدہ یاد دلایا 'تمھاری پیاری بہن' کہ اگر اسے دکان سے اپنے حصے کی کبھی ضرورت پیش آئے تو مہیا ہو جائے گا۔ اب اس کا بیٹا خاندان کی عزت بڑھانا چاہتا ہے تو کیا وہ اسے کچھ رقم مہیا کر دیں گے۔ اس پر انھوں نے 'تمھارا بھائی' کے نام سے ختم کیا تھا۔

تقریباً چار ماہ کے بعد جواب موصول ہوا۔ اس دوران اس خط کا ذکر والد کے سامنے

نکالنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس سے فوراً ان کا جلال بیدار ہو جاتا۔ جب جواب آیا تو وہ مبہم وعدوں، آداب و القاب سے پُر تھا۔ اس میں مجھے تعطیلات میں نیروبی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میرے والد کے لیے یہی کافی تھا۔ انھوں نے ماموں کو گناہ گار، کنجوس کہنا بند کر دیا۔ یہ بددعا دینی بند کر دی کہ خدا اس چور کو طاعونی آبلوں میں مبتلا کرے۔ ان کے خیال میں معاملہ نبٹ گیا تھا، اور کنجوس پیسے راستے میں تھے۔ ظاہر ہے وہ یہ تو نہیں کہتا کہ ہاں میں پیسے دے دوں گا، یہ غیر مناسب ہوتا، یہی کافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ باہر چلتے ہیں ذرا جشن منائیں گے۔

کبھی وہ اس رات کا مذاق اڑاتے جب ہم ساتھ گھر آئے تھے۔ میرے کان میں سرگوشی کر کے بتاتے کہ مجھے تو احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے کتنی شراب پی ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ اس رات وہ بہت تھکے ہوئے تھے کیوں کہ ساری شام وہ ایک نوجوان کے ساتھ اغلام بازی کرتے رہے تھے، جس کی تفصیل بتانے کی انھیں ضرورت نہیں۔ جیسا کہ مجھ سے امید کی جا رہی تھی میں ہنس دیا۔

گھر میں اب مجھے 'وہ نیروبی جانے والا شخص' کہہ کر بلایا جاتا۔ میری ماں نے گھر گھر اشیا فروخت کرنے والے شخص سے مختلف چیزیں خریدیں، جو ان کے خیال میں نیروبی کے سفر میں کام آتیں، یا احمد ماموں کو تحفے میں دی جا سکتی تھیں۔ کوئی پاسپورٹ کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ ماموں نے تعطیلات جون میں تجویز کی تھیں، خط موصول ہونے کے دو ماہ بعد۔ میں روز امیگریشن کے دفتر جاتا، سارا دن قطار میں رینگتا اور آخر میں وہی جواب ملتا۔

ایک شام جب میں اس سفر سے بالکل مایوس ہونے لگا تھا تو ذکیہ نے مجھے باہر بلایا۔ وہ باہر لگے افقی پائپ سے ذرا آگے جا کر تاریکی میں میرا انتظار کرنے لگی۔

'اگر تم چاہو تو میں کسی سے بات کر سکتی ہوں' وہ بولی 'تمھارے پاسپورٹ کے بارے میں'۔ میں اس کی شکل تو نہ دیکھ سکا مگر اس کی آواز میں شرم واضح سنائی دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ معاملہ اتنا آگے بڑھ چکا تھا۔ میرے لبوں تک فوراً یہ سوال آیا کہ 'کس سے' لیکن میں نے بروقت یہ سوال روک لیا۔

'نہیں ایسے ہی ٹھیک ہے، آخر وہ مجھے پاسپورٹ دے ہی دیں گے۔ میں روز وہاں جاتا

رہوں گا، حتیٰ کہ وہ مجھے دے دیں۔۔۔'

وہ ہنسی۔ لیکن یہ ایک افسردہ، خود رحمی کی ہنسی تھی 'کبھی تو تم ایسے بچے بن جاتے ہو' وہ بولی 'مجھے تم سے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'

'ذکیہ۔۔۔'

'بالکل منہ مت کھولنا' وہ تیزی سے بولی 'تمھیں معلوم بھی نہیں ہوگا کہ کس چیز کے بارے میں گفتگو کر رہے ہو۔ میں تو بہر حال اس آدمی سے ملتی ہی ہوں۔۔۔ میں نے سوچا اس سے تمھاری سفارش کر دوں گی۔ لیکن تم ایسا نہیں چاہتے تو۔۔۔' ہم دونوں خاصی دیر خاموش کھڑے رہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ میرے خیال میں وہ مجھ پر برس پڑنے کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں تھی۔ اور میں کسی ایسے طریقے کی فکر میں کہ میرے انکار سے اسے دکھ نہ پہنچے۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے جانور سے مدد لینے کے لیے تیار نہیں تھا جو میری بہن کی عزت سے کھیل رہا ہو۔۔

'میں تو صرف مدد کرنا چاہتی تھی' آخر وہ بولی

میں نے اسے تھوک نگلتے سنا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ نہ روئے۔ وہ ابھی سترہ برس کی ہوئی تھی۔ وہ گھر کی جانب واپس لوٹ گئی، میں نے اسے آواز دی مگر اس نے ان سنی کر دی۔

دن اب بہت آہستگی سے کٹ رہے تھے۔ بارشیں برس کے ختم ہو گئی تھیں، خشک موسم واپس آ گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے مضطرب سورج ان کا خاتمہ کر سکے، ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ سر اٹھا رہا تھا۔

چکلے کے بوڑھے مالک نے اپنے لیے ایک بکرا خرید لیا تھا۔ وہ اسے ہمارے گھروں کی درمیانی گلی میں باندھ دیتا، اور شاید ہی کبھی اسے چارہ ڈالتا۔ مکھیوں اور بھوک سے بیزار وہ اپنے قطر میں آنے والی ہر چیز پر حملہ آور ہوتا۔ اپنی لمبی رسی کی پہنچ تک تو اس نے گھاس پھونس ختم کر دی تھی، اور وہ بیلیں بھی جو سالوں سے دیوار سے لپٹی ہوئی تھیں۔ کبھی وہ تنگ آ کر منہ بھر کے مٹی ہی پھانک لیتا۔

وہ بکرا ہمارے گھر کا ایک مرکزی کردار بن گیا۔ میری ماں تو با آوازِ بلند سوال کرتی کہ کیا

بکرے کو جفتی کی محفلوں میں شرکت کے لیے خریدا گیا ہے۔ وہ وہاں بیٹھا اسے بھوک سے مرتا دیکھتا رہتا ہے۔ تو اور اس کا مصرف کیا ہے، اس کے گوشت کے لیے تو اسے خریدا نہیں ہوگا۔ میری دادی نے باقی سب چھوڑ کر اپنی بیداری کے اوقات اس بکرے کو تکنے کے لیے وقف کر دیے۔ وہ اپنی کھڑکی کے پاس بیٹھی اپنی قوتِ ارادی سے بکرے کو نگاہ نیچے کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتی۔ میرے والد، جن سے بکرے نے فوراً ناپسندیدگی پیدا کر لی تھی، اسے ہر طریقے سے ستاتے۔ کبھی وہ تاریک گلی میں باورچی خانے سے چھری اٹھا کر نمودار ہوتے، جسے وہ بکرے کے سامنے حملے کے انداز میں لہراتے، منہ ہی منہ میں اسے گالیاں دیتے رہتے۔ بکرا بھی رسی تڑانے کی جدوجہد کرتا کہ ان پر حملہ کر سکے۔

بوڑھا مالک اس تمام ہنگامے سے بہت مطمئن تھا۔ وہ اپنی کھڑکی میں بیٹھا گلی میں جھانکتا رہتا۔ اس ممیاتے، غصہ پرور بکرے کو دل چسپی سے تکا کرتا۔ میری دادی نے اپنا پیشاب ایک بالٹی میں پلنگ کے نیچے جمع کرنا شروع کر دیا۔ دن میں ایک بار وہ گلی میں نکل کر یہ بدبودار قارورہ اس پر اچھال دیتیں۔ کبھی ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کو وہ موٹے کاغذ کی تھیلی پیشاب سے بھر کے اس جانور کی سمت پھینک دیتیں۔

نہ بھوک نہ ہی ایذارسانی اس بکرے کی وحشت میں کچھ فرق ڈال سکی۔ اگر کوئی اتنا پاگل ہوتا کہ اس گلی سے گزرے تو اس پر حملہ آور ہوتا۔ میرے والد آخر تک ڈٹے رہے۔ ان کے نزدیک یہ مردانہ غیرت کا سوال تھا آخر ایک لمحہ شکست میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ انھوں نے بڈھے کو گھٹنوں کے بل بکرے کے پاؤں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہے 'تم کیا کر رہے تھے وہاں، کج رو بڈھے، دودھ دھو رہے تھے؟ محلے کے بچوں میں بھی دل چسپی پیدا ہونے لگی۔ میرے والد اس قدر مذاق کا نشانہ بننے لگے کہ اس کا اثر سعیدہ پر پڑنے لگا، جو مذاق اڑنے کے خوف سے گھر میں ہی بند رہنے لگی۔۔ ذکیہ نے اپنے آپ کو اس سب سے علیحدہ رکھا۔ وہ اپنی بے راہ روی کے چرچوں اور جذبوں کی کفالت میں مصروف تھی، وہ بکرے سے مخاصمت پالنے سے بہت بالاتر تھی۔ بچے بکرے کے لیے جو غذا بھی لا سکتے تھے لے آتے اور گھٹنوں بیٹھ کر اسے اس کے تاریک آستانے میں تکتے رہتے۔ میری دادی کا سنکی پن بہت تیزی سے بڑھا تھا۔ اب ان کی

عداوت کا رخ بچوں کی سمت پھر گیا تھا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ چکے ہوتے تو وہ تیزی سے باہر جا کر اپنے متعوی پانی سے ان پر چھڑکاؤ کرتی۔

ذکیہ کی حرکتیں اب والد سے چھپانا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ اب ذکیہ سے گفتگو نہیں کرتے، اس کی جانب دیکھتے بھی نہیں تھے۔ ہم اس دن سے خوف زدہ رہتے جب صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا، اور وہ اپنی دیوانگی کے دورے میں اس کی درگت بناتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے ذکیہ بھی کسی وحشت کے زیرِ اثر تھی۔ اسے سمجھانا ناممکن تھا۔ جب سے میں نے اس کی مدد کی پیشکش مسترد کی تھی، وہ مجھ سے گریز کرنے لگی تھی۔ ماں بھی اس سے گویا ہوتیں تو وہ نہایت بے رحمی سے انھیں خاموش کرا دیتی۔۔ وہ بدمعاش مردوں کے ساتھ ایسے تسلسل سے غلیظ معاشقے لڑا رہی تھی جیسے ان میں کسی تعطل سے خوف زدہ ہو۔ وہ بکرے سے ہماری خاندانی رنجش کو ایک مرعوب بے یقینی سے دیکھتی۔

میں بہت بور ہو چکا تھا اور امیگریشن دفتر کے روز چکر لگانے سے تنگ آ چکا تھا۔ میں مختصر کتابیں پڑھتا ہوا روز انہی راستوں پر سفر سے مایوس ہو چکا تھا۔ ڈراؤنا رمضان سر پہ تھا۔ اس کی دن بھر کی بھوک اور آہستگی سے سرکتی دن کی روشنی۔ اس کی موجودگی میں پورا قصبہ ایک غنودگی میں گھر جاتا۔ دکانیں بند ہوتیں اور لوگ دن کا بیش تر وقت سو کر گزارتے۔ بھوک کا مقابلہ تغافل سے کیا جاتا۔ جب رات ہوتی تو زندگی دوبارہ اپنے سارے ہنگاموں کے ساتھ بیدار ہو جاتی۔ ہم اپنے معدے ان غذاؤں سے بھر لیتے جن کے بارے میں دن بھر خواب دیکھتے رہے تھے۔ لوگ دل چسپی کی تلاش میں سڑکوں پر نکل جاتے اور علی الصباح تک باہر ہی رہتے۔ بچے چھپن چھپائی اور چور سپاہی کے طویل کھیل کھیلتے۔ یہ اوقات ہوتے لمبی بحثوں کے، رات گئے تک جاری رہنے والی گفتگو کے، کبھی نہ ختم ہونے والے تاش کے کھیل اور محبت کے کھیل کے اوقات۔ یہ دن بھر کی بھوک تھی جو اس وقت کو دردناک بنا دیتی تھی۔ خدا نے تو رمضان کی مشکلات ہمیں نظم و ضبط سکھانے کے لیے نافذ کی تھیں۔ لیکن دن بھر لوگوں کا پارہ چڑھا رہتا، اور پھر رات خوش خوراکی خود پر عائد کسی ضبط کی حدیں پھلانگ جاتی۔

رمضان کے ابتدائی چند دن میں امیگریشن دفتر سے دور رہا۔ جب تک کہ میرا جسم دن بھر کی

بھوک کا عادی ہوگیا۔ جب میں کاؤنٹر پر پہنچا تو کلرک مجھے دیکھ کر مسکرایا اور نفی میں سر ہلانے لگا۔
'میں امیگریشن افسر سے ملنا چاہتا ہوں' میں نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر کاؤنٹر کی روک ہٹا کر اندر گھستا چلا گیا۔ کلرک نے مجھے روکنے کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ کاؤنٹر پر جھک کے مجھے میزوں کے درمیان سے گزرتا آفس کی جانب بڑھتا دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ دفتر کہاں ہے کیوں کہ میں نے اس شخص کو متعدد بار وہاں سے نکلتے اور داخل ہوتے دیکھا تھا۔ میں دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوگیا۔ اس کا نام عمر شنکو تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت مشہور فٹ بالر تھا۔ اب محض اپنی عیاشی کے لیے مشہور تھا۔ میں نے اس کی جانب دیکھے بغیر ایک غصہ ور شکایتی دفتر کھول دیا۔ اس نے ایک دو بار مجھے روکنے کی کوشش بھی کی 'کون ہو تم، کاؤنٹر پر واپس جاؤ، تمھارے خیال میں تم کس جگہ آئے ہو؟' میں نے اسے نظر انداز کیا۔ اگر وہ مجھے باہر نکلوانے کی کوشش کرتا تو میں اسے مار بیٹھتا۔ جب میں نے اس کے ویران، خود پسند چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہی وہ شخص ہے جس سے ذکیہ میری سفارش کرتی۔
'بیٹھو' آخر اس کے چہرے پر ایک شکست خوردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
'مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔ مجھے اپنا پاسپورٹ چاہیے۔ میں روز یہاں آتا ہوں۔۔۔'
جانتا ہوں، میں جانتا ہوں' اس نے ہاتھ اٹھا کے مجھے خاموش کرادیا 'اپنا نام بتاؤ تا کہ میں تمھاری فائل نکالوں؟'
میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کے اپنا نام بتایا۔ اس نے ایک پرچی پر لکھا اور باہر نکل گیا۔ واپس لوٹا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ 'میں تمھارے خاندان سے واقف ہوں' وہ بولا 'تمھارے والد کیسے ہیں آج کل، اور باقی سب لوگ؟' اس نے کاغذات پر میرے سامنے دستخط کیے اور بولا کہ باہر لے جا کر کلرک کو دیدوں۔ آخر اس سے لچرپن برداشت نہ ہوا 'میری طرف سے پوچھ لینا سب کو' وہ بولا 'اور اپنی بہنوں کو بھی۔'
پاسپورٹ تیار ہونے میں مزید تین ہفتے لگ گئے۔ چاند رات کو بڈھے نے اپنا بکرا قربان کرکے میری والدہ کو ایک ران بھیجی تھی۔ سب لوگ اختتامِ رمضان پر مسرت کے گیت گا رہے تھے اور نئے سال کی آمد پر خوشیاں منا رہے تھے۔ میں پاسپورٹ کے اوراق پلٹتا اپنی

امیدوں کو دوبارہ بیدار کر رہا تھا۔ اس دن کی عمومی خوشی میں ذکیہ اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھی اور اپنے ایک عاشق کی کار میں گھر تک آگئی۔ میرے والد گھر پر ہی تانگا سے آنے والے ایک دور کے عزیز کی حلوہ اور کافی سے خاطر کر رہے تھے۔ جب میرے والد اس مہمان کو بس اسٹاپ تک چھوڑ کر آئے تو شدید غصے میں تھے۔ میری والدہ دروازے پر ہی ان سے ملیں اور ابتدائی پھٹکار کا بیش تر حصہ ان کے نصیب میں آیا۔ میں قریب ہی کھڑا تھا کہ اگر انھوں نے دونوں میں سے کسی پر بھی ہاتھ اٹھایا تو ضرور مداخلت کروں گا۔ ذکیہ دادی کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مایوس لاتعلقی تھی۔ وہ اتنی تنہا اور لاوارث نظر آرہی تھی کہ جس کے لیے کتنے ہی آنسو بہائے جاتے، چیخیں اٹھتیں، ناکافی ہوتیں۔ برآمدے میں میرے والد چیخ رہے تھے۔ خدا کے نام کی قسمیں کھا رہے تھے کہ سب گواہ رہیں کہ اگر اس لڑکی ذکیہ نے اپنے طریقے نہیں بدلے تو میں واللہِ باللہِ اسے گھر سے نکال دوں گا، وہ خود اپنا خیال رکھ سکتی ہے۔

میری والدہ ان پر چلائیں، گڑگڑائیں کہ وہ اپنی قسم واپس لے لیں۔ انھیں یاد دلایا کہ اس قسم کے بعد انھوں نے ذکیہ کی قسمت کو ایک بازاری کسبی میں بدل دیا ہے۔ میرے باپ نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا غصہ اب آنسوؤں میں ڈھل رہا تھا، ہم جو کر سکتے تھے، کر چکے ہیں وہ بولے۔

نیروبی کے سفر کا دن قریب آرہا تھا۔ میری ماں مجھے احمد ماموں کے متعلق جو بتا سکتی تھیں بتاتی رہتیں۔ انھوں نے مجھے سفر کی تفصیلات بتائیں۔ ایک بار سفر کر کے وہ اپنے آپ کو اس راستے کا ماہر سمجھنے لگی تھیں۔ پھر بھی یہ غنیمت تھا کیوں کہ ان کے علاوہ کسی نے ساحلی علاقے سے اندرونِ ملک کا تیس میل سے زیادہ فاصلے کا سفر نہیں کیا تھا۔

انھوں نے ریل کے سفر کی صعوبتیں بیان کیں۔ ریل کے ڈرائیوروں کی شراب نوشی کی عادت کے متعلق بتایا۔ انھوں نے مجھے نیروبی کے گلی کوچوں میں منڈلاتے اچکوں اور جیب کتروں کے بارے میں خبردار کیا۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ ماموں کو کس طرح مخاطب کروں اور وہاں کے سرد موسم کے لیے کس قسم کا لباس مناسب ہوگا۔

دادی یہ سب دیکھ سن رہی تھیں۔ ان کی ناپسندیدگی زیادہ مخفی نہیں تھی۔ کبھی کبھار وہ میری

ناز برداری سے زیادہ تنگ آ جاتیں تو میرے امتحانوں کے بارے میں پوچھنے لگتیں۔ یوں وہ اپنے عالمِ دیوانگی سے ہمارے شیخ چلی پن پر ہمارا مذاق اڑاتیں۔ بکرنے کے بعد اب ان کے ایام بہت مصروف گزرتے۔

میری ماں کو اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ احمد ماموں رقم واپس کر دیں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ دکان میں ان کا حصہ تو سفر کا خرچ نکالنے سے بھی کم ہوگا۔ اور احمد ماموں سے قابلِ ذکر رقم کا حصول اس بات پر منحصر ہے کہ میں ان کی نیک تمناؤں کا حصہ بن سکوں۔ لیکن انھوں نے میری قنوطیت کو رد کیا اور آخر مجھے بھی قائل کرلیا۔ اب سوچو تو حماقت محسوس ہوتی ہے کہ میں نے اس خیال کو پروان چڑھنے ہی کیوں دیا تھا۔ لیکن ہم سب کی قوتِ متخلیہ کا مشترکہ المیہ یہ تھا کہ ہمیں یقین ہوگیا کہ ہم غلط ہو ہی نہیں سکتے۔

اس مہینے ایک نیا قانون نافذ ہوگیا۔ ایک جاری عمل کو یوں قانونی تحفظ حاصل ہوگیا۔ آبادی کے نسلی تناسب کے اعتبار سے اسکولوں میں داخلوں اور نوکریوں کا کوٹہ مقرر ہوگیا۔ اس کے نفاذ کے لیے عوام سے اپنی نسلی شناخت کی اندراج کی ہدایت کی گئی۔ انھیں نئے شناختی کارڈ جاری کیے جائیں گے جن میں نام، عمر، پتا اور نسل کا اندراج ہوگا۔ طلب کیے جانے پر کارڈ کی غیر موجودگی فوری گرفتاری کا باعث ہوگی۔

جن لوگوں کے لیے نسلی امتیاز کسی شناختی رنگ و روپ کے بجائے محض ایک فکری اساس تھی، ان میں مایوسی پھیل گئی۔ نسل کے بارے میں جواب دہی سے انکار برطانوی تسلط کے خلاف احتجاج کا ایک طریقہ تھا، اتحاد اور قومی یک جہتی کی علامت۔ اب اس سوال کا جواب نہ دینا جرم بن گیا تھا۔ جب میں اپنا کارڈ بنوانے گیا تو میں نے ایک جھوٹا نام استعمال کیا۔ یہ احتجاج کا ایک فضول سا عمل تھا لیکن اس وقت ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ حکومت اس مخلوط کمیونٹی کا مسئلہ سلجھانے میں کتنی سنجیدہ ہے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس قانون کو تباہ کرنے کا میرا یہ معمولی عمل مشکلات کا سبب بن سکتا تھا۔ بغیر کارڈ کے کوئی سرکاری کام انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ایک جعلی کارڈ کے ساتھ پھرنے کے خطرات کے احساس نے میرے فارغ اوقات کو غارت کر دیا۔

سفر نیروبی سے ایک اتوار پہلے مجھے وہ کارڈ استعمال کرنا پڑا۔ ہر اتوار قصبے کی ساری آبادی کو ان فلیٹوں کی تعمیر میں حصہ لینا پڑتا، جو حکومت کچی آبادیوں سے نجات کے لیے بنا رہی تھی۔ ہم پہلے ہی اس طریقے سے پرامن طور پر پارٹی کا ہیڈ کوارٹرز تعمیر کر چکے تھے۔ پہلے اتوار سیکڑوں لوگ جمع ہو گئے

اس وقت مقصد پارٹی ہیڈ کوارٹرز کی تعمیر تھا۔ اسے ایک قومی اولیت حاصل تھی، حالیہ عمل ظاہر ہے اس عجلت کا متقاضی نہیں تھا۔ اس پہلے اتوار کی افراتفری اور پھر اس کے بعد کے کئی اتواروں کی بدنظمی سے کئی لوگوں کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ آخر پارٹی کے پاس اس بات کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا کہ وہ اپنے کارکنوں کو بھیج کر ان مفت خوروں کو ان کے گھروں سے نکال کر قومی فریضہ انجام دینے کے لیے بھیجیں۔

میرے سفر سے ایک اتوار پہلے پارٹی کے مجاہد گھر گھر تلاشی لے رہے تھے۔ انھوں نے عمر یا صحت کا امتیاز نہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ بوڑھی عورتیں، چھوٹے بچے، تھکے ہارے مرد، دودھ پلاتی مائیں سب کام کے لیے رضاکارانہ پیش ہو گئے۔ وہ در در جا کر دروازہ بجاتے، اور اگر اندر سے کوئی جواب نہ دے تو اس پر چیختے، مارتے، دھکے دیتے۔ حبُّ الوطنی پر ابھارتے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ شناختی کارڈ کی پڑتال بھی کرتے۔ جتنی دیر میں وہ ہمارے گھر تک پہنچے، میں اور ابا جانے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میرے والد کہتے رہے کہ جب تک ہمیں وہ کھینچ کر نہ نکالیں، ہمیں خود سے ہلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دروازے پر جا کر دیکھا تو تین آدمی تھے۔ انھوں نے جلدی سے میرے عقب میں نگاہ ڈالی۔ باہر نکلو، کام پر جاؤ۔ ان میں سے ایک نے مجھے ایک طرف دھکا دیا اور پوری آواز سے چلاتا گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے میں نے اس کے کثیف کالر کو پکڑ کے اسے پیچھے کھینچ لیا۔ جب وہ واپس گھسٹ کر میرے برابر آگیا تو میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے باہر دھکیل دیا۔

وہ تینوں ایک ساتھ متحرک ہو گئے۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے انداز میں راسخی واستقامت کی جگہ احتیاط نے لے لی۔ وہ گندے لیکن طاقت ور تھے۔ اس قسم کے لوگ ہر اس جگہ نظر آتے جہاں اس قسم کا کام ہو۔ حماقت کی حد تک پر اعتماد، جو بوڑھی عورتوں کو اس لیے

ہراس کرتے کہ اس سے ان کے مجروح وقار کو سکون ملتا۔ ان میں سے ایک مجھے بغیر آستین والا وہی شخص لگا جو سود کے سامنے ملا تھا۔ میرے والد نے مجھے بزور ایک جانب دھکیل دیا۔

'بچہ ہے، محض ایک بچہ' انھوں نے ان سے درخواست کی۔

مجھے کسی نے گھر کے مزید اندر گھسیٹ لیا، میرے خیال میں دادی نے۔ تینوں افراد بہت غصے میں تھے۔ میرے والد پر چلّا رہے تھے۔ وہ سر ہلا کر ان سے معذرت طلب کر رہے تھے۔ مجھے ان تینوں افراد کا سامنا کرنے کے لیے باہر بلایا تھا۔ وہ شیخی خورہ جسے میں نے باہر دھکیلا تھا، وہ اپنا غصہ چند گھونسوں کے راستے اتارنا چاہتا تھا۔ وہ باقی دونوں سے علیٰحدہ ہو کر مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر آ گیا۔ اپنے ساتھیوں کی آوازوں سے اس کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ میں بہت پرسکون تھا، اور ضرورت پڑنے پر مزید تاؤ کھائے بغیر اس سے بھڑ جانے کو تیار تھا۔ محلے میں ہمارے شور شرابے سے لوگ متوجہ ہونے لگے۔ بڈھا جو باہر جانے کے لیے تیار تھا، وہ بھی خوف زدہ نظروں سے جھانک رہا تھا۔ اس شیطانی بو بھرے ڈھانچے نے اپنی غصہ بھری انگلی تقریباً میرے نتھنے میں گھسا دی۔

'تمھیں خمیازہ بھگتنا پڑے گا' وہ چیخا۔ غصے سے اس کے منہ سے تھوک کی بوچھار نکل رہی تھی۔ باقی دونوں بھی گالیاں دیتے رہے۔ میرے والد نے کوشش کی کہ وہ میرے اور اس غصیلے شخص کے درمیان حائل ہو جائیں۔ انھیں غصے سے ایک جانب ہٹا دیا گیا۔ 'میری بات غور سے سنو' وہ شخص اب بھی غصے سے کانپ رہا تھا، منہ سے بوچھار نکل رہی تھی۔ 'تم باہر نکلو اور کام پر جاؤ، ورنہ ہم تمھیں دیکھ لیں گے، تم سب کو۔ تم گندی نالی کے کیڑے۔ تمھارے خیال میں یہاں تم مختار ہو؟' تینوں آدمی میری آزادی پر بکتے جھکتے رہے، سینے تان کے، اپنے بھنچے دہانوں سے کسی سستے ڈرامے کے ولن کی مانند آوازیں نکالتے رہے۔ میرے خیال میں تو وہ مجھے مار ہی ڈالتے۔

گلی مین نزدیک و دور کے لوگ تماشا دیکھنے اور سننے کی خاطر رک گئے تھے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ یہ ان تینوں کے لیے پریشانی کا باعث تھا۔ انھیں خوف تھا کہ وہ ایک کمیونٹی کے بلوے کا شکار ہو جائیں گے۔ حال آں کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ گو ہم پر ظلم کرنے والوں کو ابھی اس بات کا ادراک نہیں ہوا تھا لیکن ہم فرماں برداری کے بہت عادی ہو گئے تھے۔

'مجھے اپنے کارڈ دکھاؤ' غصیلے آدمی نے کہا۔ میرے والد نے کارڈ جمع کر کے اسے دے دیے۔ تینوں افراد نے کارڈ پر لگی تصویروں کا بغور معائنہ کیا اور پھر کارڈ واپس کر دیے۔

'تم ناموں کی پڑتال نہیں کرو گے؟' میں انھیں محض یہ جتانے کے لیے بولا کہ میں جانتا ہوں وہ اَن پڑھ ہیں۔

'میں تمھیں جان سے مار دوں گا' وہ شخص غصے سے بولا۔ اس نے جلدی سے اطراف میں مجمع پر نظر ڈالی اور مغلظات بکنے لگا۔ جب وہ گالیاں بکتے ہماری بے عزتی کر کے واپس مڑے تو انھوں نے گلی میں باقی دروازوں کو نہیں کھٹکھٹایا۔ وہ میدان کے نزدیک مڑنے لگے تو مجمع خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔ کچھ لوگ اپنے گھروں کو واپس جانے لگے۔ بڈھے نے اپنا سر ہلا کے میری جانب انگلی اٹھائی:

'یہ حماقت تھی' وہ بولا 'اب ہم سب مصیبت اٹھائیں گے' پھر مجھے آنکھ مار کے مسکرانے لگا۔ میرے والد نے میری پیٹھ تھپتھپائی۔ میں ایک ہیرو تھا 'دیکھا تعلیم ان بچوں پر کیا اثر چھوڑ رہی ہے، یہ انھیں بہادر بنا دیتی ہے' وہ بولے۔

اس دن ہم سب نے رضا کارانہ کام کیا۔ میرے والد کے خیال میں یہی عقل مندی تھی کہ مزید کوئی مصیبت نہ مول لی جائے۔ کام کی جگہ حسب معمول افراتفری تھی۔ کسی نے بڑھ کر ہمیں کام نہیں دیا، ہم انتظار ہی کرتے رہے۔ جب سورج بالکل ہی سر پر آگیا، تو ہم گھر لوٹ آئے۔

میری روانگی سے ایک رات پہلے میری والدہ نے بہت سے پکوان تیار کیے۔ قالین کو اس کے تھیلے سے نکال کر خوب جھاڑ کر مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا۔ کرسیاں دیواروں سے لگانے سے اتنی جگہ ضرور بن گئی کہ ہم سب گھس کر بیٹھ گئے۔ جیسا کہ اس سفر کے انتظار میں اب تک ان کا وتیرہ تھا وہ اسے محض ایک رسمی کارروائی سمجھ رہے تھے۔ ناکامی کے امکان کو بھی رد کر دیا گیا تھا۔ میرے والد کے خیال میں ناکامی کا تذکرہ بھی محض ایک مذاق تھا۔ ان کی موجودگی میں، مَیں اپنے شبہات بھی بھول گیا۔ اس دعوتِ شیراز اور بلند امیدوں کے درمیان لگ رہا تھا کہ میرے لیے کوئی شے ناممکن نہیں تھی۔ دور اندیشی کے آخری مشورے دیے گئے، دھمکیاں

بہت صاف الفاظ میں سکھائی گئیں اور گڑگڑا کے خدا سے مدد طلب کی گئی۔ ذکیہ ساری شام کچھ نہ بولی، لیکن جب بھی میں اس کی سمت دیکھتا تو وہ مسکرا دیتی۔

مجھے علی الصباح نکلنا تھا اور والد میرے ساتھ اسٹیشن تک جانے کو بضد تھے، اور کسی کو ساتھ آنے سے منع کر چکے تھے۔ مسئلہ کیا ہے، میں صبح کام پر جاتے ہوئے اس کے ساتھ چلا جاؤں گا تم خواتین تو ہمیشہ رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہو۔ میں اس رات بستر پر صرف روانگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ تو جب میری والدہ لوٹ کر میرے پاس واپس آئیں تو مجھے خیال آیا کہ میں نے ان کے بارے میں تو سوچا ہی نہیں۔ ہم نے تھوڑی دیر گفتگو کی، پھر وہ دوبارہ چلی گئیں۔ کہنے لگیں کسی چیز کے بارے میں فکر کی ضرورت نہیں۔ وہ مجھے نیک تمنائیں دینے آئی تھیں۔

مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں اس خیال سے ہی گھبرانے لگا کہ اگر سویا نہیں تو صبح بہت تھکا ہوا اٹھوں گا۔ پرانے شکوک اس شام کی امیدوں پر سایہ کرنے لگے۔ سفر کے پرانے خوف لوٹ آئے اور میں دیر تک جاگتا رہا۔

سنی سنائی کہانیوں کے خوف سے، میں نے درجہ سوم کی بجائے درجہ دوم میں سفر کرنے پر اصرار کیا تھا۔ اس سے مجھے ایک مقررہ بستر مل جاتا۔ تیسرے درجے میں سفر کا مطلب ہوتا کہ لکڑی کی ننگی نشستوں پر گھٹنے موڑے بیٹھے رہو۔ جب میں سوار ہوا تو میرا ڈبا خالی تھا۔ جیسا کہ مجھے مشورہ دیا گیا تھا۔ میں نے اپنا سوٹ کیس ایک نچلی برتھ کے نیچے رکھ دیا۔ کمپارٹمنٹ میں لکڑی سے دیواریں بنی تھیں۔ نشستوں کا غلاف ہرے رنگ کی نرم پلاسٹک کا تھا، جسے چھونے میں ٹھنڈک کا احساس ہوتا۔ کھڑکی کے نیچے چھوٹا سا نلکا ایک لمبی خم دار ٹونٹی سے جڑا تھا۔ نلکے کے خم کے نیچے ایک چھوٹا پیالا نما بیسن تھا۔ جو کسی سکے کی مانند چمک رہا تھا۔ کھڑکی پر پردے پڑے ہوئے تھے، جنھیں سمیٹ کر ربن سے باندھ دیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے فلموں میں دیکھا تھا میں بھی کھڑکی اوپر کر کے سر باہر نکال کے جھانکنے لگا۔ میرے والد نیچے پلیٹ فارم پر کھڑکی کے نیچے آ کر کھڑے ہو گئے۔

'کیسا ہے؟' انھوں نے پوچھا

وہ بہت خوش گوار، دوستانہ موڈ میں تھے، گفتگو سے خوش ہو رہے تھے۔ انھوں نے پنجوں

کے بل اچک کر اندر جھانکنے کی کوشش کی، مگر ان کا قد اتنا اونچا نہیں تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر گیا کہ انھیں خدا حافظ کہہ سکوں۔

'سنو' وہ بولے 'میرے پاس زیادہ وقت نہیں، محتاط رہنا۔ کوئی حماقت نہ کرنا اور لوٹ کر ہمارے پاس واپس آنا۔ سمجھ رہے ہو۔ مجھے لکھ کر سب بتانا۔ اگر کوئی مشکل ہو تو فوراً مجھے لکھ کر مطلع کرنا۔ ہماری امیدیں اور نیک خواہشات تمھارے ساتھ ہیں۔'

انھوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ اس امید میں کہ وہ سب کہہ چکے میں نے بھی خدا حافظ کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو پھر ان مفروضہ پدرانہ جذبات سے شرمندہ کریں، جن کا خود انھیں احساس بھی نہیں تھا، میں چاہ رہا تھا کہ وہ چلے جائیں۔ 'اچھے بیٹے بننا، جیسے کہ تم ہمیشہ سے ہو۔' انھوں نے دوبارہ میرا ہاتھ دبایا۔ ان کی آواز بھاری ہوگئی، اور میں اس احساس سے ہی خوف زدہ ہوگیا کہ انھیں اپنا یہ کردار پسند آنے لگا ہے۔ وہ اچانک مسکرا دیے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب انھیں اس کردار نگاری میں مزید دل چسپی نہیں رہی۔ 'خالی ہاتھ واپس مت آنا' یہ ان کی زیادہ مانوس آواز تھی۔ اپنی پوری کوشش کرنا کہ اس چور کو اپنی مدد کرنے پر آمادہ کرسکو۔ میں اپنے لیے خود کچھ نہیں مانگتا۔ بس ہمارے بیٹے کے سلسلے میں اپنا فرض ادا کرے۔ اس کو ایسے ہی نہیں چھوڑ سکتے، تم سمجھ رہے ہو؟ ہماری بے عزتی مت کرانا اور خالی ہاتھ مت واپس آنا' انھوں نے ایسے انداز سے سر ہلایا گویا جانتے ہوں کہ میں ان کی بات نہیں سمجھ رہا۔

'فکر مت کیجیے' میں نے خوش دلی سے کہا

وہ مڑے اور پلیٹ فارم کے جنگلے کی سمت چل دیے۔ میں نے انھیں تیز قدموں جاتے دیکھا تو بمشکل اپنا قہقہہ روک سکا، لیکن مجھے ایسا کرنا اچھا نہ لگا۔ جب میں ڈبے میں واپس لوٹا تو میری سامنے والی نشست پر کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک نوجوان آدمی تھا جس کا سر کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوا تو اس نے سر اٹھا کے ایک مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ میں اپنے بستر پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر پلیٹ فارم کی چہل پہل دیکھنے لگا۔ مجھے خوشی تھی کہ میرا ہم سفر ایک نوجوان تھا۔ جلد ہی ریل روانگی کی تیاری میں پھوں پھاں کرنے لگی۔

'کیا وقت ہوا ہے؟' اس کی آواز بہت پر اعتماد تھی، میں نے مڑ کے اس کی جانب دیکھا

اور نفی میں سر ہلا دیا، میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ وہ مسکرایا اور اٹھ کر کھڑکی کی سمت آ گیا، اس کے بال چھوٹے ترشے ہوئے تھے جیسے وہ پولیس یا فوج میں ہو۔

اس کا چہرا بہت دبلا اور سیاہ تھا۔ اس کے جسم کی ساخت بہت ورزشی تھی میں نے اس کتاب پر نگاہ کی جو اس نے اپنی نشست پر الٹی رکھ دی تھی، پیٹر ابراہام کی کتاب ''کان کا بیٹا۔''

'ہم چل کیوں نہیں رہے، اب یقیناً روانگی کا وقت ہو گیا ہو گا؟' یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور ضرورت سے کچھ زیادہ دیر تک مجھے دیکھتا رہا، جیسے مجھے پڑھ رہا ہو۔ اس نے اپنا تعارف موسیٰ مووینی کے طور پر کرایا، اور آگے جھک کر ہاتھ ملایا۔ 'تم کہاں تک جا رہے ہو؟' اس نے دوبارہ بیٹھتے ہوئے کتاب پر ایک اچٹتی نظر ڈالی اور پھر اسے بند کر کے اپنے برابر میں رکھ لیا۔

'نیروبی'، میں اس کے بے تکلف رویّے اور شگفتگی کو اپنانے کی کوشش کرنے لگا۔

'میں بھی' اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ وہ کچھ دیر ایسے ہی مسکراتے ہوئے، حوصلہ افزائی میں سر ہلاتا رہا۔ شاید اسے مجھ سے کسی ردِ عمل کی توقع تھی۔ میں بھی مسکرا کے سر ہلانے لگا۔ 'آپ کو کیا کہہ کے مخاطب کرتے ہیں، جناب؟' آخر اس نے نرمی سے پوچھا۔

'معاف کرنا' میں نے خود کو بے وقوف اور غیر مہذب محسوس کیا 'میرا نام حسن ہے، حسن قمر۔۔۔'

'تم سے مل کر خوشی ہوئی حسن' موسیٰ مووینی' اس نے اپنا نام دہرایا۔ اس نے ایک پر اعتماد مسکراہٹ کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا مجھے اس نام سے واقف ہونا چاہیے تھا؟ اس نے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اسے اب پھر ریل پر غصہ آنے لگا تھا 'کیا یہی شہر تمھارا وطن ہے؟'

میں نے اثبات میں سر ہلایا، تو وہ ترس کھا کے سر ہلانے لگا 'یہ کس قدر مردہ جگہ ہے' اس نے غیر ضروری قطعیت سے کہا۔ 'بھائی میں یہاں دو دن سے ہوں، اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں کہ میرا دل اچاٹ ہو چکا ہے۔ یہاں چکلوں اور مقعد پرستوں کے سوا کچھ نہیں۔ انھیں چاہیے اس جگہ کو گرا کے دوبارہ تعمیر کریں۔ برا مت ماننا میرے دوست۔'

'تم کہاں سے ہو؟' میں نے پوچھا

'دارالسلام' وہ بولا 'خوابوں کا شہر'

میں نے اس شہر کے بارے میں جو سن رکھا تھا اس کے بعد تو وہ شہر اسی کو مبارک ہو۔ لیکن میں اس سے 'تو پھر' کہہ کر اپنی کم علمی کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا، ورنہ مجھے اقرار کرنا پڑتا کہ میں وہاں کبھی نہیں گیا۔ لیکن آخر مجھ سے رہا نہیں گیا 'میں نے سنا ہے کہ بہت بدصورت اور گرد اڑنے والا شہر ہے؟' میں اس پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ میں اس کی پر اعتماد مسکراہٹ اور ورزشی خدوخال سے خوف زدہ نہیں ہوں۔

'بدصورت' مجھے پتا تھا کہ اس کی حیرت مصنوعی نہیں ہے۔ 'وہاں سوپر مارکیٹ، پانچ ستاروں والے ہوٹل اور نائٹ کلب ہیں، یہاں کیا ہے؟ تمھیں خود جا کر دیکھنا چاہیے!' ٹرین نے زور سے سیٹی بجائی اور حرکت میں آ گئی، دھیرے، دھیرے پلیٹ فارم کے ساتھ دوڑنے لگی۔ موسیٰ نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور ہنسنے لگا۔

'مجھے اپنے مروڑ کا انتظام کرنا ہے' وہ بولا 'میں نے شاید راہ داری کے اختتام پر بیت الخلا دیکھا تھا۔ تم میرے بیگ کا خیال رکھو گے۔ ریل میں بہت سے بھوکے پھر رہے ہیں۔'

وہ مجھے پسند آیا تھا۔ وہ چیزوں سے اس قدر بے پروا دکھائی دیتا تھا۔ میرے لیے تو ہر شے نئی تھی۔ باہر کا منظر، ریل۔ میں نے ساری زندگی یہیں گزاری تھی لیکن ان چیزوں کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ نزدیک کے درخت اور جھاڑ افق کو اوجھل کر رہے تھے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہم کتنی جلدی آبادی کو پیچھے چھوڑ آئے۔

یہ محض دوسرا موقع تھا کہ میں گھر سے دور ہوا تھا۔ پہلی دفعہ اسکول کے ساتھ چواکا کا دورہ تھا، سمندر کے کنارے پورے دس روز۔ لہروں کی افزائش یا اسی قسم کا اور کوئی مضمون تھا۔ نیم پختہ مچھلیوں اور لجلجے پین کیکوں کے ساتھ گزارے مزید دس روز۔ اساتذہ کا اصرار تھا کہ ہم اپنا کھانا خود تیار کریں۔ رات گئے ہم ساحلی گھر کے برآمدے میں بیٹھ کر جذباتی رومانوی گیت گاتے۔ ہم رات بھر تاک لگا کر قبرستان میں بھوت کا انتظار کرتے کہ جو کبھی نمودار نہ ہوا۔ وہ ساحل پر ہاکی کا کھیل۔ اور پھر کسی نے وہ غار دریافت کیا کہ جس میں کائی اور موت کی ملی جلی

بورچی تھی۔ ہمیں اس غار کی تہہ میں ایک ٹھنڈے پانی کا تالاب ملا۔ قدیم خدائے آب کا روضہ۔ ہم اس میں اس وقت تک تیرتے رہے جب تک کہ مقامی عورتوں نے پتھراؤ کر کے ہمیں وہاں سے نکال نہ دیا، کہ ہم ان کے پینے کے پانی کو آلودہ کر رہے تھے۔ وہاں ہماری آخری شب برسات ہوئی۔ ہمارے پتلے گدے بھیگ کے ٹاٹ کے بورے بن گئے تھے۔ لیکن اس قبرستان سے سمندر تک اس طوفان میں دوڑ کا کیا لطف تھا۔ اسی ہڑبونگ میں ہماری بچوں جیسی کلکاریاں اور چیخیں، ایسی مسرت کہاں نصیب ہوگی، سمندر کے کنارے گزرے پورے دس دن!

ٹرین کے ہچکولے اپنے تسلسل میں تقویمی اثر رکھتے تھے، لیکن بہرا کر دینے کی حد تک پُر شور۔ تسموں میں جکڑے پردوں کی سلوٹوں سے چھیڑ خانی کرتی، کھلی کھڑکی سے ہلکی ہوا اندر آرہی تھی۔ لیکن باہر بہت گرمی کا احساس ہوتا تھا۔

نیروبی میں ہماری آمد اگلی صبح متوقع تھی۔ میری والدہ نے میرے لیے کچھ کھانا باندھ دیا تھا، اور مجھے معلوم ہے ایک رضائی بھی رکھی تھی۔ میں نے اطمینان کیا کہ پاسپورٹ بیگ میں موجود ہے۔ اپنی اس نئی آزادی کا لطف لینے کے لیے، میں نے پیچھے ہوکر پاؤں سامنے والی نشست پر پھیلا لیے۔ دروازے پر دستک ہوئی اور فوراً ہی ایک پستہ قد، گھٹے ہوئے جسم کا بوڑھا نمودار ہوا۔ اس نے میرے پیروں کی جانب دیکھا اور اپنی موٹی اُنگلی سے ان کی جانب اشارہ کیا:

'ہٹاؤ!'

اس نے پہلے ٹوپی ٹھیک کی، لباس درست کیا، کندھے پیچھے کیے پھر میرا ٹکٹ طلب کیا۔ کسی سوال، دھمکی یا بدکلامی کے بنا۔ اس نے اپنی جیبیں ٹٹولیں اور ایک نوٹ بک نکالی 'بستر ہے؟' اس نے پوچھا، میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کچھ لکھ کر نوٹ بک واپس رکھ لی۔ 'پہلی بار نیروبی جا رہے ہو؟' اس نے مزید پوچھا تو میں نے پھر سر ہلا دیا۔ وہ ذرا خفا سا نظر آنے لگا۔ شاید مجھے منہ سے کچھ بولنا چاہیے تھا، یا مسکرانا چاہیے تھا، مگر الفاظ منہ سے نہ نکلے۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ میرا دانستہ ارادہ قطعاً کسی بدتمیزی کا نہیں تھا۔

نشست اتنی آرام دہ نہیں تھی، جتنی پہلی نظر میں لگی تھی، میری بھیگی قمیض پشت سے چپک گئی تھی۔ میں اپنے پیروں کو ذرا ورزش دینا چاہتا تھا کہ ذرا باہر نکل کر دیکھوں۔ مگر میں موئی کا

بیگ بھی بغیر نگرانی کے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اپنے ماموں کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہتا تھا، کم از کم فی الحال نہیں۔ وہ جب بھی میری سوچ پر دستک دیتے تو میں انھیں لوٹا دیتا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ میں بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ جب ٹرین چل دی تھی تو میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھنے لگا تھا۔ دروازہ دوبارہ کھلا، اور آہستگی سے موئی نے پہلے سر اندر کیا، پھر اندر آ گیا۔

'چلا گیا؟' وہ بولا 'تمھیں معلوم ہے میں بنا ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔' میری حیرت کو دیکھ کر وہ میری جانب مسکرایا۔ 'میں کبھی بھی ٹکٹ نہیں خریدتا۔ یہ کلکٹر اتنے احمق ہوتے ہیں کہ ٹکٹ خریدنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر سہ ماہی میں دو بار آتا جاتا ہوں۔ لیکن کبھی پکڑا نہیں جاتا۔ میں نیروبی کی یونی ورسٹی میں ایک طالب علم ہوں۔'

اس نے یہ بات نیچی نظروں کے ساتھ کہی، میں یقیناً بہت متاثر نظر آیا ہوں گا، کیوں کہ وہ پھر نگاہ اٹھا کے مسکرا دیا 'ادب پڑھ رہا ہوں' وہ بولا، اور کتاب اٹھا کر دونوں ہاتھوں کے درمیان پھیلا لی۔ اس نے کتاب اپنے پہلو میں رکھی اور دوبارہ میری جانب دیکھا۔ یہ نگاہ بتدریج ٹکٹکی بن گئی۔

'تم کبھی کچھ بولتے بھی ہو؟' اس نے خفگی سے پوچھا 'تم ٹھیک تو ہو؟'

'ہاں، ہاں' میں اس کے براہ راست حملے سے متاثر ہوئے بغیر بولا

'تو جیسا کہ میں بتا رہا تھا میں کبھی قیمت ادا نہیں کرتا'

'ہاں، ہاں' میں نے کہا

'تم کہہ رہے تھے کہ یہ تمھارا پہلا موقع ہے؟' ہنہ 'ابھی تمھیں بہت کچھ دیکھنا ہے۔ نیروبی بہت زبردست جگہ ہے، مجھے تو بہت پسند ہے۔ اور یونی ورسٹی بھی بہت اچھی ہے، لیکن سوائے کھانے کے۔ جو غذا وہ ہمیں کھانے کو دیتے ہیں وہ بالکل زہر ہے۔ پچھلے برس ہم نے ہڑتال کر دی تھی کہ اس وقت مزید لیکچر نہیں ہوں گے جب تک کہ وہ باورچی کو فارغ نہیں کر دیتے، یا اسے قتل نہیں کر دیتے۔ ہاں واقعی، ہم ہڑتال پر چلے گئے تھے۔'

'کامیاب رہے؟' میں نے دریافت کیا۔ اب میں اس دباؤ میں تھا کہ کچھ کہوں، دل چسپی کا اظہار کروں۔

'ابتدا میں تو نہیں' موئی مجھ سے خوش ہو گیا۔ 'شروع میں تو وہ سیکیورٹی گارڈ لے آئے۔ لاٹھی بردار جسیم لوگ۔ لیکن طلبہ بھی بے قابو ہو گئے۔ ان گارڈز کا سارے کیمپس میں تعاقب کیا۔ بلڈنگوں کی توڑ پھوڑ کیا، گاڑیوں کو نقصان پہنچایا۔ سچ تو یہ ہے کہ پھر انھوں نے فوج طلب کر لی۔ کیا بتاؤں تمھیں، یہ افریقہ، ہم سب بالکل وحشی ہیں۔ انھوں نے ایک طالب علم کو ہلاک کر ڈالا اور پھر باقی سب کو گھر بھیج دیا۔ جب ہم واپس آئے تو پھر انھوں نے باورچی کو نکالا۔'

شروع میں ہی کیوں نہ نکال دیا تھا؟

'اب کھانا بہتر ملتا ہے؟'

وہ ہنس پڑا 'نہیں وہ تو اب بھی زہر ہے'

'تمھاری تعلیم کا کیا حال ہے، پڑھائی تو اچھی ہو رہی ہے؟'

اس نے میرا سوال ٹال دیا۔ منہ بنا کے بولا۔ 'شہر؟ نیروبی اور بھلا کیا۔ کیا شہر ہے!

'دارالسلام سے بھی بہتر؟'

'ہاں' وہ ہنسا 'میں تو بس دار میں ہی رہتا ہوں۔ میرے والدین کینیا سے آئے تھے۔ افریقہ میں سب سے اچھا نیروبی ہے، تم خود ہی دیکھ لو گے۔ بس یہ کہ اس کا مزہ لینے کے لیے لکھ پتی ہونا ضروری ہے۔ وہاں بہت سارے ہندوستانی ہیں۔'

'کیا تمھیں کورس کے لیے بہت پڑھنا ہوتا ہے؟' میں ہندوستانیوں کے خلاف کوئی کینہ پرور تقریر سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

'تم سنتے نہیں ہو کیا؟ میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ نیروبی اصل میں رات کو بیدار ہوتا ہے۔ تم شام سے شروع کرو تو بھی صبح ہونے تک شہد ہی چاٹ رہے ہو گے۔ نیروبی میں ایسا حسن ہے جو تمھیں مشرقی افریقہ میں اور کہیں نہیں ملے گا۔۔۔۔ کالی، سفید، عرب، صومالی، ہندوستانی اور جو لذتیں وہ بہم پہنچاتی ہیں۔۔۔'

وہ ہنس کر انتظار کرنے لگا کہ میں مزید سوالات کروں۔ شاید میری صورت سے ناپسندیدگی کا اظہار ہوا ہوگا کہ وہ اچانک سنجیدہ اور پڑھاکو نظر آنے لگا۔ دوبارہ اپنی کتاب اٹھالی۔ 'لیکن یہ مت سمجھ لینا کہ وہاں بس تفریح ہی ہے' وہ تنبیہ کرنے لگا 'یونی ورسٹی میں بہت

سخت محنت کرنی ہوتی ہے۔ ہم خوش قسمت تھے کہ وہاں تک پہنچ گئے۔ ملک کا مستقبل ہمارے ہاتھوں میں ہے۔'

ریل کی رفتار آہستہ ہو رہی تھی۔ موئی نے سر کھڑکی سے باہر نکالا، حال آں کہ ایسا کرنے کی ممانعت تھی 'ہم اللہ میاں کے پچھواڑے میں ہیں' اس نے مڑ کر اعلان کیا 'ہوسکتا ہے ڈرائیور کو کسی جھاڑی میں جانے کی ضرورت ہو۔ اف! کس قدر گرمی ہے۔'

وہ بیٹھ گیا اور احتیاط سے انگلیوں کی پوروں سے اپنی قمیض کا ایک کونا اٹھا کر جھلنے لگا۔ خود کو پنکھا دینے لگا اور پھر کتاب اٹھا کر اس سے ہوا لینے لگا۔

'تمھیں پیٹر ابراہامز پسند ہے؟' میں نے پوچھا

'وہ برا لکھاری تو نہیں' اس نے کہا 'لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ بہت احساس کم تری کا شکار رہتا ہے، وہ کسی افریقی کی طرح نہیں لکھتا۔ تمھیں پتا ہے مجھے یہ کتاب کس کی یاد دلاتی ہے؟ ایلن پیٹن کی۔ اس میں بھی اسی آزاد خیالی کا پرچار ہے، خود ساختہ اور الجھی ہوئی۔ سمجھ رہے ہو میری بات، اس میں کہیں مظلوم افریقی عوام کی جھلک نظر نہیں آتی۔'

ریل جیسے ہی دوبارہ حرکت میں آئی، میں بیت الخلا کی تلاش میں چل دیا۔ اب دن چڑھ آیا تھا اور سورج کی تمازت میں فاصلوں اور ہیئت کی شناخت دشوار تھی۔ میں دور فاصلے پر پہاڑوں کا ہیولہ دیکھ رہا تھا، زمین بنجر اور خالی تھا۔ ہوا نے شدت پکڑ لی تھی۔ سرخ ریت کے وحشی بگولے صحرا میں رقص کر رہے تھے۔ ریل کی دوسری جانب مجھے وسطی سطح مرتفع کی ڈھلان نظر آرہی تھی، ارغوانی مائل دھندلی۔

میں ڈبے کے کونے میں سکڑ گیا تا کہ دو لڑکیوں کو گزرنے کی جگہ دے دوں۔ وہ خوب صورت ہندوستانی لڑکیاں ہنستی ہوئی میرے پاس سے گزریں تو ان کے کولہے میری ٹانگ سے رگڑ کھا گئے۔ ان کے ڈیڈی ان کے عقب میں آرہے تھے تو میں ایسا بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

بعد میں ریل ایک چھوٹے گرد آلود اسٹیشن پر ٹھہری۔ کوئی مسافر نہیں اترا۔ گرمی اتنی تھی کہ کسی نے اتر کے چہل قدمی کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ ایک بوڑھی عورت پلیٹ فارم پر تنہا

بیٹھی تھی۔ اس رو بہ زوال سفیدی سے پٹی اسٹیشن کی عمارت سے ٹیک لگائے۔ یہ نیروبی کے راستے میں ایک چھوٹے، بلا وجہ کے اسٹیشن کی ایک غیر ضروری طور پر بڑی عمارت لگ رہی تھی۔ شاید یہ اسٹیشن کسی کے پر شکوہ منصوبے کا حصہ رہا ہوگا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ پنکھ بندھی زندہ مرغیاں اس بڑھیا کے پیروں کے اطراف جمع تھیں۔ ان کے سر اچانک ایسے قیاسی انداز میں گھومتے جیسے انھیں معلوم ہو کہ کیا نظر آئے گا مگر ہنوز دیکھا نہ ہو۔

میں اپنے پیٹ کی آگ بجھانا چاہتا تھا مگر اس فکر میں تھا کہ کیا موئی کے پاس اس کا اپنا کھانا ہے۔ میری دعوت پر کہ میرے ساتھ شریک ہو جائے وہ خوش ہو گیا۔ میں نے ماں کی دی ہوئی مرغی اور روٹیاں نکال لیں۔

ہم اسٹیشن پر تقریباً پندرہ منٹ رکے۔ جب ٹرین نے اپنی بھاپ جمع کر لی اور اسٹیشن چھوڑنے کے لیے تیار ہوئی تو اس بوڑھی عورت نے اپنا سامان جمع کیا۔ مرغیوں کو ان کے بندھے ہوئے پاؤں سے پکڑا۔ جتنی دیر ہم رکے رہے ریلوے کا کوئی ملازم نظر نہیں آیا۔ جب ہم رخصت ہو رہے تھے اس وقت بھی نظر نہ آیا۔ ۔ نہ کوئی اترا تھا اور نہ ہی میں نے کسی کو سوار ہوتے دیکھا۔ یہ بیابان میں ایک پراسرار سا اسٹاپ تھا۔ جس میں بغیر کسی نام کی تختی کے ایک پر اسرار بڑا اسٹیشن تعمیر تھا۔ جب میں نے اس امر کی جانب اشارہ کیا تو موئی ذرا حیران نظر آیا۔ پھر بولا شاید ریل سستانے کے لیے رک گی ہوگی۔

موئی گیا اور چند لمحوں میں بعد آلوچوں کی ایک تھیلی لے کر نمودار ہوا۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ یہ کہاں سے لایا ہے، میرا خیال تھا کہ اس نے چرائے ہوں گے۔ اس نے تھیلی ہم دونوں کے درمیان بچی کچی مرغی کے ساتھ رکھ دی۔ وہ ہر چیز کے بارے میں تبصرہ کر رہا تھا، مذاق اڑا رہا تھا، اپنے آپ میں مست تھا۔ ہم نے نلکے پر جھک کر اس چھوٹی ٹونٹی سے پانی پیا۔

'یہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کے قارورے کی دھار یاد دلا رہا ہے' وہ بولا 'بوند، بوند۔'

اول شام ہم بنجر میدان پہنچ گئے، دیکھنے کو کچھ بھی تو نہیں تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں اس معاندانہ علاقے سے میں گزر رہا تھا، اس کا حصہ نہیں تھا۔ ہم نے پردے گرا دیے اور اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔ پتا چلا کہ موئی کے پاس کوئی بستر نہیں ہے، لہٰذا میں نے اسے اپنی رضائی

دے دی۔ (Kikoi)

'میں بلا سامان سفر کرنا پسند کرتا ہوں' وہ رضائی اپنے گرد لپیٹتے ہوئی بولا۔ 'پھر یہ کہ میں اپنے ایک مہربان ساتھی مسافر کو نیکی کا موقع فراہم کر رہا ہوں۔ مجھے تو پھر بھوک لگ رہی ہے؟'

میں نے اصرار کیا کہ جو روٹی بچ گئی ہے اسے صبح کے ناشتے کے لیے محفوظ کیا جائے۔ ہم رات کا کھانا کھائے بغیر لیٹ گئے۔۔ میں نے کسی کو اپنے کھانے میں شریک کرنے کا انتظام نہیں کیا تھا۔ حال آں کہ مجھے ایسا کرنا برا نہیں لگا تھا، میں موسیٰ کی رفاقت پر خوش تھا۔

'تو تم جب سیاحت نہیں کر رہے ہوتے تو کیا مصروفیت ہوتی ہے؟' رفتار پکڑتی ریل کے آہستہ ہلکوروں کے درمیان لیٹے، اس نے دریافت کیا۔

'کچھ نہیں، میں نے ابھی اسکول ختم کیا ہے۔'

وہ تاریکی میں غرّایا۔ ''مجھے بھی وہ وقت یاد ہے، امکانات تلاش کرنا، اس امید پر کہ کوئی ہم پر مہربانی سے مسکرا دے گا۔ میں خوش قسمت تھا۔ میں اپنے اسکول کا بہترین طالب علم تھا تو میرے لیے یہ آسان تھا۔ میں سیدھا یونی ورسٹی پہنچ گیا۔ تمھیں پتا ہے میں اپنے اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا، اذانیہ ہائی اسکول۔ میرے خیال میں تو یہ بڑی بات ہے' وہ ایک کہنی پر جھکا اٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموشی سے اپنی عظمتوں پہ غور کرتا رہا۔ 'تو میرے لیے آسان تھا۔ میں ادب پڑھ رہا ہوں۔ چاہوں تو اسے جاری رکھوں، چاہوں چھوڑ دوں، سمجھے، میرا مطلب ہے ادب۔ اسکول میں، میں نے ادب میں اچھی کارگردگی دکھائی تھی، اور مجھے علم ہے کہ میرے استاد کی یہی خواہش تھی کہ میں ادب پڑھوں، ہیڈ ماسٹر کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ اچھا خیال ہے۔ 'ادب ہماری زندگی ہے' وہ کہا کرتا۔ وہ احمق بڈھا، وہ کیا جانتا تھا زندگی کے بارے میں۔''

'تو پھر تم کیوں پڑھ رہے ہو یہ، تم نے وہ کیوں نہیں کیا جو تم کرنا چاہتے تھے؟'

'میں تو محض ایک ڈگری چاہتا تھا، ایک کار چاہتا تھا، ایک اچھا گھر، رات کے کھانے میں مرغی، اور کچھ خوب صورت خواتین، میں نے سوچا تھا کہ ادب آسان ہوگا' ۔ وہ میری جانب دیکھ کے انتظار کرنے لگا۔ میں نے سر ہلا کے اسے بات جاری رکھنے کا اشارہ دیا۔ 'اور یہ ہے بھی آسان، فضول ہے۔ یہ ساری ہیومینیٹیز ہی فضول ہے۔ ہمارے پاس بس افریقی آرٹ، افریقی

ادب، افریقی تاریخ، افریقی معاشرت اور یہی سب فضولیات ہیں۔ اور ہم اپنے لیے ایک اسکریو ڈرائیور یا ٹیلکم پاؤڈر کا ڈبا بھی نہیں بنا سکتے۔ ہمیں ٹیکنالوجی کی ضرورت ہے۔ ہم اپنی ضرورت کی ہر چیز امریکا یا یورپ سے منگواتے ہیں۔ وہ ہمیں ان چیزوں کی خریداری کے لیے قرضہ تک دیتے ہیں۔ ہمیں یہ سیکھنا ہے کہ ہم خود اپنی موٹر کار بنائیں، خود اپنی فیکٹریاں تعمیر کریں، اپنی کپاس خود بنیں۔۔۔ اصل راز یہ ہے۔ اس وقت تک یہ سب چیزیں نری بکواس ہیں۔'

وہ اپنے نکتۂ نظر پر زور دینے کے لیے آگے جھک آیا۔ 'سنو' وہ بولا 'ہو سکتا ہے کہ ہمیں ترقی کے لیے کچھ عرصے افریقی آرٹ کو بھلا دینا چاہیے' اس نے مسکرا کے پہلو بدلا 'میں تو کچھ وقت کے لیے افریقی عوام کو فراموش کر دینے کے لیے بھی تیار ہوں۔ لاکھوں خرچ کر کے قبل از تاریخ کے قبائلیوں کے لیے اسپتال بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ جب یہ تن درست ہو جاتے ہیں تو ان کا پیٹ بھرنے کے لیے مزید لاکھوں خرچ کرنے پڑتے ہیں۔، وہ خود کچھ کرتے ہیں، نہ بناتے ہیں۔ میں تو ان سب کو گولی مار دوں۔ اگر چند ہزار وحشیوں کے قتل سے ہم سب کی زندگی سنور سکے، تو ایسا ہی سہی۔ ہمارے بچوں کی بہتری اسی میں ہے۔' وہ رکا کہ اگر مجھے اعتراض ہو تو وہ اسے سن سکے۔

جب میں کچھ نہ بولا تو وہ پھر آگے جھک آیا۔ مجھے قائل کرنے کے لیے بے چین تھا۔ میرے خیال میں یہ اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ ''روایت' کی گفتگو، یہ افریقی، وہ افریقی، یہ سب محض مزید افریقی فن کاری ہے، یہ لوگ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہیں۔ یہ روایت کے علم بردار سنجیدہ نہیں ہیں۔ انھیں صرف ایسی روایت سے دل چسپی ہے کہ اپنے سرین کو مزید فربہ کر سکیں۔ ہمیں ایک طاقت ور آدمی کی ضرورت ہے جو دور بین ہو، ایک اسٹالن کی۔ اس کے بجائے ہمارے نصیب میں یہ چرب زباں سردار ہیں، جن کی واحد دل چسپی پیسا اور غیروں کی عورتیں ہیں۔ یہ سیاہ فاموں کے وقار کی بات کرتے ہیں اور پھر انھی کو برباد کرتے ہیں، یہ ہمیں بے وقوف سمجھتے ہیں۔'

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کے پاؤں فرش کو چھو رہے تھے۔ 'وہ تمھاری حرص سے فائدہ اٹھاتے ہیں، سمجھ رہے ہو؟'

'تمھاری قربانیاں کہاں سے شروع ہوں گی؟' میں نے دریافت کیا

'نہیں اسے مذاق میں مت اڑاؤ۔ یہ لوگ سوچتے نہیں۔ دیکھو یہ لوگ ہندوستانیوں کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں۔ یہ حماقت ہے۔ کیا حرج ہے کہ اگر وہ یہاں آ کر بہت دولت کما رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر انھوں نے شہریت لینے سے انکار کر دیا؟ ان کے پاس مہارت ہے۔ ان کے پاس پیسا ہے۔ پہلے ہم انھیں استعمال کرلیں، پھر ہم ان حرامیوں کو باہر نکال سکتے ہیں۔ ہم سفید فاموں کو تو باہر نہیں نکالتے۔ ان سے تو ہم بہت خوف زدہ رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ ہمیں پسند کریں۔ افریقی آرٹ، افریقی تاریخ۔۔۔ ہم ان سے التجا کرتے ہیں کہ ہمیں بھی انسان سمجھیں، لیکن ہندوستانیوں کو ہم ڈھونڈ، ڈھونڈ کر باہر نکالتے ہیں، ہم بچوں جیسی حرکتیں کر رہے ہیں۔ یہ بہت مایوس کن ہے۔'

'میں نے پوچھا تھا کہ تم قربانی کہاں سے شروع کرو گے؟ کون سے قبیلوں سے ابتدا کرو گے۔ ہندوستانیوں کی باری کب آئے گی؟ پھر عربوں اور صومالیوں کی باری کب لگاؤ گے؟ پھر اس کے بعد تم کس کو قربانی کا بکرا بناؤ گے؟'

'قربانی کا بکرا، یہی تو مسئلہ ہے' وہ چنگھاڑا 'اسی لیے ہم کچھ نہیں کرتے۔ ہم سب اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں۔ اپنی باری کے منتظر۔ منتظر کہ کوئی وہاں باہر سے آئے اور ہماری مدد کرے۔ ہم خود اپنی مدد نہیں کرتے۔ اب کس کی باری آئے گی، اب یقیناً ہماری باری آنے والی ہے۔۔۔ جلد یا بدیر۔ سوائے اس کے کہ ہم اس بارے میں کچھ کرسکیں۔'

'کیا کرسکیں؟ دوسروں کی قربانی دیں؟'

مجھے اس سے خوف آ رہا تھا۔ میں نے پہلے بھی لوگوں کو ایسی باتیں کرتے سنا تھا۔ ممکن ہے میں نے خود بھی ایسی باتیں کی ہوں، لیکن کبھی اس یقین اور جذبے کے ساتھ نہیں۔ ہم اپنے ملک کو لٹتے دیکھ کر، تنگ آ کر بہت سی حماقت آمیز باتیں کرتے ہیں۔ موسیٰ کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ وہ جو کہہ رہا ہے اس پر یقین بھی رکھتا ہے۔ حال آں کہ مجھے نہیں یقین کہ وہ ہم سے زیادہ کچھ کہہ رہا تھا۔

'ہم مظلوم ہیں' میں نے کہا 'اور ممکن ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو کہ ہم بیٹھے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ خود کچھ نہیں کرتے۔ اتنے تشدد کی موجودگی میں تم لوگوں سے کیا چاہتے ہو؟ قربانیاں تو روز ہی دی جا رہی ہیں۔ ایک شخص یا کوئی اور شخص منتخب کر کے ملک کی بہتری کے لیے قربان

کر دیا جاتا ہے۔ اس سے ہمیں ریاست اپنی طاقت کا واضح ثبوت دیتی ہے، اور ہم سب خوف زدہ چوہوں کی مانند چھپتے پھرتے ہیں۔ سازشوں اور قتل عام کے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ہمارے آقا ہمیں یہ کھیل مہیا کرتے ہیں۔'

'کھیل' وہ غصے سے بولا 'تمھارے خیال میں ہم کیا ہیں؟ جنگلی؟ تم تو ہمیں ٹارزن کی کسی فلم کے خون کے پیاسے کردار بنا رہے ہو۔'

'یہ تم ہو جو قبائلیوں اور ہندوستانیوں کے قتل پر آمادہ ہو۔'

'اگر ضروری ہو تو۔' وہ چلایا 'اگر ہمیں ان کو قتل کرنا پڑے جو ہمارا استحصال کر رہے ہیں، یا ہماری ترقی میں حائل ہیں۔ ان کے لیے میں کہتا ہوں ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔'

میں اسے آگے جھک کر ایک جذبے سے اپنا دفاع کرتے دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ اسے ابھارنے میں مجھے لطف آرہا ہے۔

'ہم یہ کام تمھیں ڈگری، کار اور گھر ملنے سے پہلے انجام دیں یا بعد میں؟' میں نے دریافت کیا

'یہ ناانصافی ہے' وہ پیچھے ہوتے ہوئے بولا

'یہ محض اعلیٰ درجے کی نفرت ہے موئی۔ تم قتل کی بات ایسے کرتے ہو جیسے وہ کوئی کھیل ہو۔ ترقی کے لیے یہ کس قسم کی قیمت ہے؟'

'کوئی قیمت بھی زیادہ نہیں' وہ میرے سامنے انگلی لہراتے ہوئے بولا 'جب تک ہم خود اپنے لیے کچھ نہیں کرتے، اور ہم ہفتے کے ہر دن ان سفید فاموں کے پاس بھیک مانگنے کے لیے جاتے رہیں، تم ترقی، انصاف اور اس قسم کی دوسری باتوں کو بھول جاؤ۔ اور یہ اگر کسی اسٹالن سے ہی ممکن ہے، تو میں کہتا ہوں کہ ہمیں بھی ایک اسٹالن چاہیے۔'

ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچے تھے، لیکن وہ مجھے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ اپنے دلائل کے ناقابلِ شکست ہونے کے خیال میں محفوظ تھا 'مجھے یقین ہے کہ اسٹالن تمھیں رات بھر کلبوں میں رنڈی بازی کرنے دے گا' میں نے کہا۔ وہ ہنسنے لگا۔ وہ اس خیال سے مجھے طرح دینے پر آمادہ تھا کہ میں شاید شکست ماننے پر آمادہ ہوں۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے بتی بجھا دی۔ وہ اب بھی

تاریکی میں مسکرا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ چند سالوں کے بعد وہ کیا کر رہا ہوگا۔ کیا وہ کلبیت کا شکار ہوگا، کہ جسے اپنے ان جذبوں کی یادیں فضول سراب محسوس ہوں گی۔ میں نے اسے کروٹ بدلتے سنا، اپنے بیگ میں کچھ ٹٹولتے اور پھر پانی کی ٹونٹی کھولتے۔

'تم کیا کر رہے ہو؟' میں نے پوچھا 'بیسن میں پیشاب کر رہے ہو کیا؟'

'نہیں' وہ ہنسا 'بو کچھ رطوبت نچوڑ کے نکال رہا ہوں۔ تمھیں چاہیے صابن؟'

'تم مشت زنی کر رہے ہو؟' میں نے کچھ دل چسپی سے اسے سراہتے ہوئے کہا

'ہاں، ہاں' وہ ہانپتے ہوئے بولا، اسی دوران اس کا ہاتھ صابن سے جھاگ بناتا رہا۔

'آپ میرے تسلسل میں خلل ڈال رہے ہیں، جناب! تمھیں صابن چاہیے یا نہیں؟'

'نہیں' میں نے کہا 'مجھے صابن نہیں چاہیے۔'

میں نے چادر سر کے اوپر لے لی اور اس آواز کی طرف سے اپنا دماغ بند کر لیا۔ میرا خیال ہے کہ فوراً ہی سو گیا تھا۔ میں ٹھنڈ کے احساس سے بیدار ہوا اور فوراً ایک مسرت سے یاد آیا کہ میں کہاں ہوں۔ مہین پردوں سے سورج جھانک رہا تھا، لیکن ابھی اتنی تمازت نہیں ہوئی تھی کہ خنکی ختم ہو جاتی۔ موئی پشت کے بل لیٹا اب بھی سو رہا تھا۔ ادھ کھلے منہ، اور ایک جانب دبے ہوئے ایک بازو کے ساتھ وہ کتنا معصوم لگ رہا تھا۔ میں نے خاموشی سے لباس تبدیل کیا کہ اس کی نیند خراب نہ ہو۔۔ مجھے معلوم تھا کہ ہم چند گھنٹوں میں پہنچ جائیں گے، لہٰذا میں تیار ہو جانا چاہتا تھا۔ وہ تو یہ سب پہلے بھی دیکھ چکا تھا، لیکن میرے لیے تو سب نیا تھا۔ اور میں کچھ بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔ راہ داری سنسان تھی، اور کچھ دیر میرے ذہن میں یہ خیال آتا رہا کہ شاید موئی اور میں اس ٹرین کے واحد مسافر ہیں۔

بیت الخلا میں کوئی موجود تھا۔ میں دروازے کے پاس کھڑا ہو کر انتظار کرنے لگا۔ لیکن دروازے کی دوسری طرف سے معدے میں بل ڈالنے والی آوازوں نے مجھے وہاں سے ہٹا دیا۔ میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں اور کچھ دیر کے بعد دوبارہ آؤں۔ لیکن مثانے پر دباؤ فوری عمل کا خواست گار تھا۔ اور وہ غریب جو اندر اپنا معدہ خالی کر رہا تھا وہ ایسی کیا گند پھیلاتا جو گھر کے بیت الخلا کی کھڈیوں میں پڑی زدہ گند سے بدتر ہوتی؟

اب ہم جس علاقے سے گزر رہے تھے وہ ذرا سیاہی مائل اور قابلِ کاشت لگتا تھا۔ حدِ نظر تک پہاڑیاں بڑھ کر ارغوانی افق کو گلے لگا رہی تھیں۔ سرپھری ریل آگے بڑھتی رہی۔ اس کی لاتعلقی اور بے پروائی مسرت انگیز تھی۔ جیسے کوئی دوڑنے والا کھلاڑی پاس سے گزرنے والوں سے ہاتھ تو ملا رہا ہو لیکن اس کی سوچ اختتام تک پہنچنے کی خوشی میں محو ہو۔ اطمینان کی دولت سے ثمر بار سبز اترائیاں سکون سے کوبڑ نکالے کھڑی تھیں۔ یہ ہمارے قصبے کی پتلی سڑکوں کے دم گھٹے ماحول سے ہر لحاظ سے مختلف تھیں۔ ان سڑکوں کی فضا ماضی کی حق تلفیوں اور حسد کے جال سے گندھی ہوئی تھی۔ پھر کیا عجب تھا کہ لوگوں نے اس زمین کے لیے لڑنا سیکھ لیا تھا، اس کے لیے قتل و معذور کر لیتے تھے۔ جب کہ ایک سیلن زدہ گندی گلی کے لیے کون اتنا خطرہ مول لے۔

موجودہ اطراف میں، ریل کی پٹریوں کے کنارے اونچی گھاس سے محبوس تھے، جو کہ صبح کی ہلکی خنک روشنی میں بھی تیز اور زہریلی لگ رہی تھی۔

بیت الخلا کا دروازہ کھلا اور ایک طویل القامت آدمی برآمد ہوا۔ لگتا تھا اسے اپنا توازن برقرار رکھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اتنا زور لگانے کے بعد تو اس کا چل سکنا ہی ایک معجزہ تھا۔ میں نے اس کے لڑکھڑا کے دور ہو جانے کا انتظار کیا، پھر جھجکتے ہوئے بیت الخلا کا رخ کیا۔ میں نے ایک گہری سانس کھینچ کے دروازہ پورا کھول دیا، اور اس سے پہلے کہ میرا ارادہ کم زور ہو میں اندر گھس گیا۔

ایک شخص فرش پر پڑا ہوا تھا۔ پایہ ستون اور پردہ کرنے والی دیوار کے درمیان پھنسا ہوا۔ اس کے گھٹنے اٹھے ہوئے اور ایک دوسرے سے دور تھے۔ میں پیچھے ہٹا اور دروازہ بند کر دیا۔ میرا یہاں کیا کام تھا؟ میں دوبارہ اندر گیا، لگتا تھا جیسے وہ سو رہا ہو۔ اس کی سانس مشکل سے اور بھاری چل رہی تھی۔ اس کی قمیض خون آلود تھی لیکن کہیں زخم کا نشان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ دونوں طرف سے پھنسے ہوئے تھے جیسے انھیں پتلی سی جگہ میں گھسایا گیا ہو۔ اس کا چہرہ ورم آلود اور زخمی تھا۔ میں نے آہستگی سے اس کے پاؤں پر اپنا پیر مارا۔ وہ ایک بار کراہا، اس نے اپنا منہ کھولا مگر بنا کچھ کہے بند کر دیا۔ میرا یہاں کیا کام تھا، میں نے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

میں نے راہ داری سے آوازیں آتی سنیں۔ وہ طویل القامت آدمی واپس آرہا تھا، اس کے ساتھ ٹکٹ کلکٹر بھی تھا۔ وہ سرکاری آدمی چیختا ہوا اس طویل القامت آدمی کو آگے دھکیل رہا تھا۔ جب وہ دروازے کے پاس پہنچے تو لمبے آدمی نے درشتگی سے مجھے ایک جانب دھکیل دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے کے ایک جانب خون لگا ہوا تھا۔ اس نے دروازے کی جانب اشارہ کیا، اور انتظار کیا کہ سرکاری آدمی پہلے اندر داخل ہو۔ ٹکٹ کلکٹر کو اب تک اپنی جیکٹ کے بٹن لگانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اور اس نے اس کام کے لیے یہی موقع مناسب جانا۔ اسے سب سے اوپر کے بٹن میں دشواری ہو رہی تھی۔ پھر آخر وہ گردن کی موٹی تہوں کے گرد بٹن لگانے میں کامیاب ہو گیا۔

'تم' وہ میری جانب مڑا اور اپنی حاکمیت کے جلال کو آزمایا 'تمھارا بھی اس میں کوئی ہاتھ ہے۔ میں تمھیں اور باقی سب کو اگلے اسٹیشن پر باہر پھنکوا دوں گا۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'

'میں تو یہاں اندر جانے کے انتظار میں کھڑا تھا' میں نے احتجاج کیا 'اپنی آواز میں خوف کی آمیزش پر پر مجھے بہت غصہ آیا 'میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'

'تو یہاں سے دفعہ ہو پھر' لمبا آدمی بولا

'تم چپ رہو' سرکاری کارندہ بولا، اور اپنی انگلی سے اسے انتباہ کیا 'وہ شراب اب بھی تمھارے دماغ میں گھوم رہی ہے، ہے ناں؟ تمھیں کس نے کہا ہے کہ حکم چلاؤ۔ اپنا رویہ درست کرو ورنہ اگلے اسٹیشن پر تمھیں قید کر دوں گا۔' اس نے لمبے آدمی کی شکست خوردگی میں نگاہیں نیچی ہونے کا انتظار کیا۔ پھر میری جانب پلٹا 'کیا یہی کافی نہیں ہے کہ بڑی عمر کے لوگ مدہوشی کی حد تک پی لیں۔ اس پر طرہ یہ کہ لوگ ان کے گرد تماشہ لگائیں۔ جیسے انھیں اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ چلو نکلو یہاں سے۔'

اس شور سے لوگ بیدار ہونے لگے تھے۔ جیسے ان کے نہار منہ دروازوں کے پیچھے سے نمودار ہونے لگے تو کارندے نے ان کی جانب ہم دردی طلب نظروں سے دیکھا۔ میں سکڑ کر اس کے پاس سے اور پھر لمبے آدمی کے پاس سے گزرا۔ اس نے اپنے چہرے کا زخمی رخ مجھ سے دوسری جانب کر لیا۔

'کیا ہو رہا ہے وہاں' واپسی کے راستے میں ایک شخص نے مجھ

'میرے خیال میں کوئی زخمی ہوگیا ہے' میں نے بتایا۔

اس نے جلدی سے راہ داری پر نظر ڈالی اور دوبارہ مجھے دیکھا، جیسے یہ یقین کرنا چاہتا ہو کہ میں کوئی سنگین مذاق تو نہیں کر رہا۔ وہ تیزی سے خود مشاہدہ کرنے چل دیا۔ موئی کو میں نے پھر بھی سوتا پایا۔ اس کی نیند کی آسانی پر مجھے غصہ آیا۔ ان حالات میں وہ بے حسی اور سنگ دلی سے کیا کم تھی۔ میں نے سوچا اسے جھنجھوڑ کے اٹھا دوں۔ لیکن اس کی گفتگو کے تقاضوں کے خیال نے باز رکھا۔ غالباً مجھے اپنی کم عقلی پر ایک جامع اور عالمانہ خطبہ ملتا۔ میں نے اس پر سے نگاہیں ہٹائیں اور سوچنے لگا کہ اب آیندہ کیا ہونے والا ہے۔

ناشتے کے لیے میرے پاس کافی روٹی تھی، لیکن غالباً مجھے اس میں شراکت کرنی پڑے گی۔ جب ہم پہنچیں گے تو غالباً مجھے ماموں کے گھر تک ایک ٹیکسی بھی لینی پڑے گی۔ میرے والد نے انھیں میری آمد کی تاریخ کے بارے میں لکھ دیا تھا۔ لیکن وہ یا تو مصروف ہوں گے یا فراموش کر چکے ہوں گے۔ میں ان سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ لیکن میرے سفر سے قبل چند مہینوں میں ان کے بارے میں سنی ہوئی بچپن کی کہانیاں دہرائی گئی تھیں۔ مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ انھوں نے کاروں کی خرید و فروخت سے بہت پیسے کمائے تھے، اور اب ایک معزز حیثیت کے حامل تھے۔ میرے والد کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسمگلنگ کے ذریعے بہت دولت کمائی تھی۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ اس میں کتنا سچ تھا۔ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کتنے امیر ہیں، اور کیا وہ مجھے تعلیم کے لیے کچھ پیسے دے سکیں گے، یا مستعار کر سکیں گے۔ میری ماں نے کہا تھا کہ جتنا وہ بتا سکتی تھیں سب بتا چکی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ مجھ سے چھپا رہی تھیں۔ اور جو انھوں نے مجھے بتایا تھا اس میں سچ سے زیادہ روایت کو دخل تھا۔ وہ ان کے ناگوار مزاج اور ریچھ جیسے غصہ ور دوروں کے بارے میں بتاتی تھیں۔ میں نے انھیں یاد دلایا کہ اس کی تو مجھے بہت مشق تھی، اور میں کوشش کروں گا کہ انھیں تاؤ نہ دلاؤں۔ دوسرے اوقات میں وہ ان کی بے داغ و مہربان طبیعت کا ذکر کرتیں۔ جی ہاں۔ اس کا ثبوت تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ انھوں نے محض چند سو میل کے فاصلے پر رہنے والی اپنی غریب بہن کے لیے کچھ نہ کیا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ میں ایک بے کار مہم پر نکلا تھا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے مجھے آنے کی دعوت دی تھی، لیکن یہ امید رکھنا حماقت تھی کہ

ایک بھائی جو اپنی غربت کی ماری بہن کے لیے کچھ نہ کرے، اب اس سے یہ امید کہ وہ اس بہن کی اولاد کی خاطر ہزاروں سے ہاتھ دھول لے گا؟ ایسا طرزِ زندگی اسی کو مبارک ہو!

پھر بھی، سوائے ذرا سی بے عزتی کے اور کیا نقصان ممکن تھا؟ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ میں بے وقوف بنتا۔ پھر مجھے یہ موقع مل رہا تھا کہ سفر کرکے دنیا دیکھوں، ایک مختلف فضا میں سانس لوں، اور آزادی اپنے شکنجوں سے مس ہوتی محسوس کروں۔ دلدلی علاقہ عبور کرکے، نیل میں بہتے اسکندریہ تک پہنچوں۔ شاید میری آمد میرے ماموں کو سخاوت کی بدمستی میں مبتلا کردے۔ انھیں پرانی غلطیوں کے ازالے کا موقع دے۔ وہ یقیناً میری فراست اور دیانت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ اور یقیناً شرمندگی کی آگ میں جھلسیں گے کہ انھوں نے ایسے پیکرِ کامل کو اس کی اعلیٰ تر حکمت کی تلاش میں مدد کرنے سے انکار کیا۔ فی الحال تو اتنا ہی غنیمت تھا کہ میں ان تنگ گلیوں کے حبس سے فرار حاصل کروں، نکل کے دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔

میں کسی اور بیت الخلا کی تلاش میں نکل پڑا۔ اب راہ داری میں مزید لوگ جمع تھے اور سفر کی ابتدا کے مقابلے میں اب ریل میں زیادہ رش تھا۔ جب میں لوٹا تو کمپارٹمنٹ خالی تھا۔ موسیٰ کے لوٹنے سے پہلے میں بچی ہوئی روٹی کھا گیا۔ وہ میری دی ہوئی کیکوئی اوڑھے، ایک پلاسٹک برش سے اپنے دانت مانجتا واپس آگیا۔ وہ کچھ دیر بیسن پر جھکا اپنے منہ کو رگڑ کے، کلیاں کرکے، دھو کے صاف کرتا رہا۔ اس نے میری کیکوئی کے ایک پلو سے اپنا منہ خشک کیا۔ وہ بالکل تازہ دم دکھائی دیتا تھا، زندگی سے خوش۔ اس نے مسکرا کے اپنے رخساروں کو اوپر سے نیچے رگڑا۔ مجھے اس پر رشک آیا۔ اس کے مقابلے میں میری مسکراہٹ پھیکی اور بیمار لگتی تھی۔

'کوئی زخمی ہو گیا ہے' اس نے بنا کسی شرم کے کیکوئی اتار دی 'کوئی بدذات شرابی، کسی نے اس کو مار پیٹ کے اس کے پیسے چھین لیے، وہ خون آلودہ تھا۔ میں تمھیں بتا رہا ہوں کہ آس پاس بہت سنگ دل، حرامی منڈلا رہے ہیں۔ ایک دفعہ مجھے یاد ہے کہ نیروبی میں۔۔۔'

وہ رکا، مجھے خیال ہوا کہ وہ اپنی کہانی کے تانے بانے جمع کر رہا ہے۔ اس نے اپنی پتلون کی زپ لگائی۔ کچھ دیر بے یقینی سے کھڑا رہا، پھر مسکرا کے کہنے لگا 'اس قسم کی کہانی کے لیے ابھی بہت صبح ہے' وہ بولا 'پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔'

'میں کھا چکا ہوں' میں ذرا جھینپ کے بولا

اسے شاید میری بات کا یقین نہیں آیا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہو گا کہ مجھ میں ناشتے کی قوت خرید نہیں 'یہ دعوت میری طرف سے ہے' وہ بولا۔ 'میرا خیال ہے، ہمیں یقیناً نیروبی میں ملاقات کا انتظام کرنا چاہیے۔ تم مجھ سے ملنے یونی ورسٹی ضرور آنا۔ بس کسی سے بھی موئی موونیی کے بارے میں پوچھ لینا۔ ہم کہیں باہر چلیں گے کچھ رنڈی بازی کریں گے۔ میں تمھیں اپنی کچھ شاعری دکھاؤں گا۔ ارے، کیا تمھیں اس پر حیرت ہوئی؟' وہ دروازے پر کھڑا میرا منتظر رہا۔

'نہیں' میں بولا 'میں واقعی کھا چکا ہوں'۔

اس نے کندھے اچکا کے اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا، اور مجھے اپنی کیکوئی فرش سے اٹھانے کے لیے چھوڑ گیا۔ میں نے کیکوئی پر اس کی پچھلی رات کی کارگزاری کے نشان ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر وہ صاف لگتی تھی۔ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر پہاڑوں کو دیکھنے کے سوا اب مزید کچھ کرنے کو نہیں تھا۔ اونچی، بھوری گھاس ہوا میں ہلکورے لے رہی تھی، خاموش پہاڑیوں پر اپنی سرسراہٹ سے لہریں بناتی، ایک قدیم زمانے سے صبر آموز خاموشی کے ساتھ۔ دور سنسناتے کانٹوں کی جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ریل کی مست سبک رفتاری اب ختم ہو چکی تھی، وہ آہستگی سے قدم اٹھاتی، آخری فاصلہ طے کر رہی تھی۔

نیروبی قریب آیا تو مغرب میں نگونگ (Ngong) کی پہاڑیاں نمودار ہو گئیں۔ موئی نے ان کی نشاندہی کی، اور ان کے نظر آنے پر ہم خوشی سے ہنس پڑے۔ ایک طیارہ جو اترنے کے مراحل میں تھا ہمارے سروں پر سے گزرا تو ہم فوراً ایک کھڑکی سے دوسری کھڑکی کی جانب لپکے۔

'واپس آ کے خوشی ہو رہی ہے' موئی کمپارٹمنٹ میں جست لگا کے داخل ہوا 'تم مجھ سے ملنے ضرور آنا'

اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور کہا کہ ریلوے کارندوں سے بچنے کے لیے اسے بہت چوکنا رہنا ہوگا۔ ہم نے ہاتھ ملایا۔ اس کے جانے پر مجھے افسوس ہوا۔ اس نے پھر مجھے یاد دلایا کہ ہمیں ضرور نیروبی میں ملنا چاہیے۔ ملتجی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ہاتھ ہلا کے الوداع کہا۔

(۴)

یہ ایک بڑا اسٹیشن تھا، کیا اسے اتنا عظیم ہونا ضروری تھا۔ حیرت انگیز طور پر مجھے کوئی گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا ٹکٹ دکھایا، اور مجھے بغیر کسی پوچھ گچھ کے جانے کی اجازت دی گئی۔ گرمی بہت تھی، میں پسینے میں اپنے آپ کو باسی، شرابور محسوس کررہا تھا۔ میں نے سفر آزمودہ مشک کی خوش بو کا سہارا لیا۔ مجھے لوگوں کا اژدھام، چیخ و پکار اور مختلف نوع کے یونی فارم یاد ہیں۔ کوئی زیادہ رومان پرور مسافر ہوتا تو اسے افریقی زندگی کے چٹخارے کے طور پر بیان کرتا۔ زندگی کی قدرتی تال کا رقص۔ مجھے مجمع سے خوف اور گھبراہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، مجمع سے لڑتا، لیکن میں اس کے بہاؤ کا مقابلہ نہ کرسکا۔ میں نے اپنا بیگ مضبوطی سے تھام لیا۔ خوف تھا کہ کسی وقت بھی ایک ہاتھ آگے بڑھے گا اور اسے مجھ سے چھین لے گا۔

مجمعے کی دھکم پیل نے مجھے باہر پہنچا دیا، ٹیکسی شہر میں دوڑنے لگی لیکن میں اپنی گھبراہٹ میں کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ مجھے یہ یاد ہے کہ میں چوڑی سڑکوں اور اونچی عمارتوں کو دیکھ کر خوش ہوا تھا، کہ وہ میری امیدوں کے مطابق بارعب تھیں۔ ان سے ترتیب اور امارت جھلک رہی تھی۔ فٹ پاتھ لوگوں سے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے پرسکون رہنے کی کوشش کی۔ میں نے پوری

کوشش کی کہ یہ بات کسی طرح ظاہر نہ ہو کہ میں مضافات کا رہنے والا ہوں جو ابھی شہر میں وارد ہوا ہے۔ میں اپنے آپ کو یاد دلاتا رہا کہ ہمارا ساحلی قصبہ اس وقت سے بھی زیادہ پرانا ہے جب نیروبی محض ایک خیال رہا ہوگا۔ ہم چین سے اس وقت بھی تجارت کر رہے تھے جب ریلوے وجود میں آئی جس نے ان خود پسند مشین گھروں کو جنم دیا۔ ڈرنے کی کیا بات تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور خاموش اور آزردہ سا تھا، اسے نہ باہر کے مجمعے سے کوئی دل چسپی تھی نہ اپنے مسافر سے۔ وہ ایک بد مزاج یک جہتی سے گاڑی چلا رہا تھا۔ وہ صرف ایک بار غصے سے بڑبڑایا جب ایک ہندوستانی لڑکا فٹ پاتھ سے چھلانگ لگا کر ہمارے سامنے سے سڑک پار کر گیا۔ ہم شاید کافی دیر کی مسافت کے بعد اس متمول محلے میں پہنچے، جہاں میرے ماموں کا مسکن تھا۔ میں نے گھروں کی بڑھتی ہوئی شان و شوکت دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ افواہوں نے ایک غریب آدمی کی خوش قسمتی کو ایسا بڑھایا تھا اس کا ہوادار مکان ایک محل ہو گیا تھا۔ ایسا ہوتا ہے۔۔ یہ اطمینان بخش تھا کہ اب تک میرے ماموں کے بارے میں روایتی داستانیں سچ ثابت ہوئی تھیں السلام وعلیکم یا عموں احمد۔ اہلاً وسہلاً یا نور اللہ۔ صبح بخیر جناب، میں مشق کرتا رہا۔

جس مکان پر ہم رکے، دوسرے مکانوں کی طرح اس کے سامنے باڑ نہیں تھی۔ بلکہ ساختہ آہنی زنجیر کا ایک سلسلہ سڑک کو باغ سے علیحدہ کر رہا تھا۔ سامنے کا باغ زیادہ تر گھاس پر مبنی تھا۔ گھر کے نزدیک پودے لگے تھے اور ایک دروازے کے نزدیک ایک بڑا پھولدار گل خیرو کا پودا لگا تھا۔ گھر کے بازو میں ایک تناور پلاس کا درخت تھا، اور اس کے عقب میں نمائشی پالم۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہارن دیا۔، ہاتھ ہلایا، اور چلا گیا۔ اس کی اس اچانک خوش مزاجی کے لیے میں تیار نہیں تھا، اور جواباً ہاتھ ہلانے میں سستی کا شکار ہو گیا۔ جب تک جواب میں اپنا ہاتھ اٹھایا وہ کار اگلے مکان کی باڑ کے پیچھے روپوش ہو چکی تھی۔

مجھے امید تھی کہ اب تک کسی نے مجھے گھر کے اندر سے دیکھ لیا ہوگا۔ اس سماجی برتری کے مقابل مجھے اپنی آمد کا مقصد احمقانہ اور چھچھورا لگا۔ دروازہ مقفل تھا، لیکن میں اس کے لیے تیار تھا۔ میں نے اپنا بیگ نیچے رکھا اور سیدھا ہو کر زندگی کے پہلے دروازے کی گھنٹی بجانے کے لیے تیار ہو گیا۔ مجھے ایک سریلی گھنٹی کی امید تھی جو مختلف برآمدوں میں گردش کرے گی۔ لہٰذا

دوسری سمت سے سنائی دینے والی کرخت گھنٹی نے مجھے حیران کر دیا اور میرا سکون مضطرب ہو گیا۔ میں سمجھا شاید میں نے ہی کچھ غلط کر دیا ہے، سوچنے لگا کہ دوبارہ گھنٹی بجاؤں یا نہیں۔

ایک لڑکی نے دروازہ کھولا اور اس کے سہارے کھڑی ہو گئی۔ میری آمد کا مقصد دریافت کرنے کی خاطر اس نے بھنویں اچکا کے اپنی ٹھوڑی ذرا بلند کی 'جی؟'

مجھے یاد ہے کہ میں اس سلوک پر کتنا شاکی اور دکھی ہو گیا تھا۔ میں کوئی فقیر تو نہیں، میں نے اسے گھورتے ہوئے سوچا۔ وہ دروازے سے ذرا پیچھے ہٹ گئی کہ میرا پوری طرح جائزہ لے سکے۔ وہ کسی بھی لمحے مدد کے لیے پکارنے والی ہے۔ اس نے اوپر سے نیچے تک میرے لباس اور بیگ پر نظریں دوڑا کر میرا معائنہ کیا۔

'میرا نام حسن عمر ہے' میں نے وہ تقریر شروع کی جو اس مرحلے کے لیے تیار کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت چمکی۔ مجھے خیال آیا کہ میں انگریزی میں مخاطب ہوں۔ اس نے اپنے برہنہ بازو سینے پر باندھ لیے، ایک پاؤں پر وزن بدلا اور ایک گہرا سانس کھینچا۔

'جی؟' وہ پھر بولی۔ وہ اس مرحلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ میں اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا، تو جواباً وہ بھی مسکرا دی۔ طنزیہ، ناخوش، ہونٹوں کی خفیف سی لرزش۔ اس نے پھر جان بوجھ کر ذرا جارحانہ انداز میں اپنی ٹھوڑی بلند کی۔ میں اس بد دماغی کے لیے تیار نہیں تھا، پھر بھی مسکرا دیا۔

'میں بوانا احمد بن خلیفہ سے ملنے آیا ہوں' اس دفعہ میں نے زیادہ صاف اور چبا چبا کے کہا

'وہ گھر پر نہیں ہیں۔' اس نے اپنے بازو دروازے کی سمت بڑھائے، اس کے پاؤں اختتامی منظر کے لیے تیار تھے

'لیکن میں تو ان سے ملنے آیا ہوں' میں نے جلدی سے کہا

'لیکن وہ یہاں نہیں ہیں' وہ اس بار نسبتاً کم درشتگی سے بولی

'انھیں میری آمد کی خبر ہے' میں نیچے اٹھ کر اپنا بیگ اٹھانے لگا۔ میں اب غصے سے سوچنے لگا تھا کہ الٹے قدموں واپس لوٹ جاؤں۔ اس سے میرا زخم خوردہ وقار عریاں ہو جائے گا

اور اسے شرمندگی ہوگی۔

'جی؟' وہ بولی اور میری وضاحت کا انتظار کرنے لگی۔ مجھے اس کے لہجے اور اس کی متامل متلاشی نگاہوں سے ذرا ڈھارس بندھی۔

'وہ میرے منتظر ہیں' مجھے امید کی جھلک نظر آئی، ذرا سا تاسف بھی کہ مجھے لوٹا ہی کیوں نہ دیا تھا۔ میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھایا تو وہ جھجک کے ایک جانب ہوگئی، تاکہ میں اندر جاسکوں۔ میں نے درنمدا پہ اپنے جوتے تا دیر احتیاط سے رگڑ کے صاف کیے۔ میں نے کہانیاں سن رکھی تھیں کہ کس طرح دوست باہر سڑک کی گند اور مٹی ایسے گھروں میں لے جاتے ہیں۔ میں نے جھک کر اپنے ربڑ کے سول والے جوتے اتارے۔ مجھے اپنی پشت پر اس کی اکتاہٹ کا احساس ہوا۔ اس کا ہاتھ میرے کندھے کو چھو گیا، خفیف سا لمس، بنا کوئی دباؤ ڈالے۔

'تمھیں جوتے اتارنے کی ضرورت نہیں' وہ بولی۔

میں اپنے آپ کو بے وقوف سا محسوس کرنے لگا اور سیدھا ہوگیا۔ وہ مجھے یقین دلانے کے انداز میں مسکرائی۔ میں نے ایسے کندھے اچکا دیے گویا ان چیزوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ غلطی سب سے ہوتی ہے۔ مجھے اس وقت یہ خیال نہ آیا کہ اس سے احتجاج کرتا کہ جہاں سے میں آیا ہوں وہاں گھر میں جوتے پہننا بدتمیزی شمار ہوتی ہے۔ وہ یہی سمجھی ہوگی کہ میں بے شرمی کی حد تک چاپلوسی کر رہا ہوں۔

'خوش آمدید' اس نے راہ داری کی طرف اشارہ کیا اور میرے آگے چل کر راستہ دکھانے لگی۔ فرش اور دیواروں پر فرحت بخش رنگ کیا گیا تھا۔ گہرا بنفشی، جس پر قالین کا دھوکا ہوتا تھا۔ بھورے ریشم کا نازک سا قالین بچھا تھا۔ راہ داری کے کونے پر جالی دار کھڑکی کے نیچے ایک دھاتی صندوق رکھا ہوا تھا، جس پر ایک پتلی گردن والا اونچا گل دان رکھا تھا جس میں بوگن دیلیا کے پھول سجے تھے۔ اس امارت کی تعظیم میں مجھے اپنے شانے جھکتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ مجھے ایک بڑے، روشن کمرے میں لے گئی۔ ایک پوری دیوار شیشے کی تھی اور اس میں سے باہر باغ کا منظر نظر آ رہا تھا۔ کیا نیروبی میں پڑوسی لڑکے پتھر نہیں پھینکتے؟ موئی اسی قسم کی

رہائش گاہ کے لیے ان قبائیلیوں کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ باغ پھیل کر ایک ترائی میں اتر گیا تھا، اور رفتہ رفتہ باڑ کی جانب اتر گیا تھا۔ باغ کے کناروں پر مجھے درخت اور گل صلیبی کی جھاڑیاں لگی تھیں۔ اس نے آتش دان کے پاس ایک کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ ایک بہت بڑی کرسی جس پر قالین کے رنگ کا کپڑا چڑھا ہوا تھا۔ میں نے جھک کر بیگ زمین پر رکھا اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مڑا، وہ جا چکی تھی۔ میں نے آتش دان میں جھانکا۔ اس میں تو جھاڑو پھری ہوئی تھی، اور ایسے صاف تھا جیسے کبھی استعمال ہی نہ ہوا ہو۔ میں نے تصور کیا کہ ایک دبلا لڑکا اس تپلے سوراخ سے چمنی صاف کرنے کے لیے اوپر چڑھ رہا ہے، لیکن یہ تصور کرنے میں ناکام رہا۔ میں کرسی میں دھنس گیا، اتنی گہرائی میں کہ میں خود حیران رہ گیا۔ دیہاتی لڑکا شہر پہنچ گیا۔

ریڈیو اتنی دھیمی آواز میں بج رہا تھا کہ کافی تلاش کے بعد وہ آتشدان کی دوسری جانب ملا۔ باغ سے اچانک ایک چیخ کی آواز سنائی دی تو میں نے بھاگ کے شیشے کے دروازے سے باہر جھانکا۔ ایک بڑا سیاہی مائل پرندہ فضا میں بلند ہوا تھا، اس کے پر سستی سے حرکت کر رہے تھے، یہاں تک کہ وہ پہاڑ کی ترائی میں گم ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ انھوں نے یقیناً مور بھی پال رکھے ہوں گے۔ کوئی زور سے ہنسا تو میں نے گردن گھما کر اس کا ماخذ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ میں کرسی پر واپس لوٹ گیا مگر باغ والے دروازے پر نظریں جمائے رکھیں۔

وہ داہنے ہاتھ پر ایک محراب سے داخل ہوئی۔ ظاہر ہے کہ پہلی بار وہ گئی بھی وہیں سے تھی۔ وہ چائے کی ایک کشتی اٹھائے تھی جس پر ایک بڑا جگ اور دو گلاس رکھے تھے۔ اس نے کشتی مجھ سے نزدیک ترین میز پر رکھ دی، اور اس کے پاس گھٹنے کے بل بیٹھ گئی۔ میں اس کی اتنی قربت سے بدحواس ہو گیا۔ اس نے مسکرا کے مجھے ایک گلاس پکڑا دیا۔

'خوش آمدید' وہ بولی 'اب میں جان گئی ہوں کہ تم کون ہو۔ جب میں باورچی خانے میں تھی تو مجھے یاد آیا کہ تم میرے پھوپھی زاد ہو۔ ہیں ناں۔ تمھیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔ ڈیڈی نے کہا تھا کہ تم آؤ گے، مگر میں تاریخ بھول گئی تھی۔ سفر کیسا تھا؟'

ڈیڈی، اس نے انگریزی کا لفظ استعمال کیا تھا، مجھے پتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چھری کانٹے سے کھاتے ہوں گے، اور سہ پہر کی چائے بھی پیتے ہوں گے۔ 'میرا سفر بہت اچھا گزرا،

شکریہ۔ یہ جوس بہت اچھا ہے، کس چیز کا ہے؟ چکوترے کا جوس ہے۔ اس کے چہرے پر چھوٹے باریک تل تھے، جو پھول کر پیشانی پر ابھر آئے تھے، یہ مجھے بالکل برے نہیں لگے۔ وہ دوبارہ مسکرائی اور اپنا گلاس تھام کے کھڑی ہوگئی' تم بہت تھک گئے ہوگے' وہ بولی۔ میں دیکھتی ہوں کہ اگر کوئی کمرا تیار ہے۔تم کچھ کھاؤ گے؟'

وہ معذرت کرکے محراب کے پیچھے غائب ہوگئی۔ چندلمحوں کے بعد میں نے اسے باغ کو عبور کرتے دیکھا۔ میں اس کا غلام ہو چکا تھا۔ جیسے نیروبی دیکھنا ہی کافی نہ تھا، کہ میں اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے رہتا۔۔۔ میں تو بس ایک فاصلے سے ہی پوجا کر سکتا تھا۔ جب وہ بہت نزدیک آئے تو اس کی خوش بو کے حصار میں گرفتار ہو سکتا تھا، وقتاً فوقتاً ایک مسکراہٹ کی امید کرسکتا تھا۔

کوئی شخص محراب سے اندر داخل ہوا تو میں اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہوگیا۔ وہ میرے ماموں سے بہت کم عمر تھا، شاید تیس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ وہ بہت دبلا تھا، اس کی آنکھیں چہرے سے ابلی پڑ رہی تھیں، بازو دونوں جانب سیدھے لٹک رہے تھے۔ میرا پہلا خیال تو یہی تھا کہ وہ کوئی رشتہ دار ہوگا۔

'اهلاً' میں نے اسے مخاطب کیا۔

'صبح بخیر جناب' وہ انگریزی میں مخاطب ہوا

اس نے کندھے جھکا کے دونوں ہاتھ جوڑے اور سر جھکا لیا۔ وہ اسی طرح سر جھکائے ذرا ایک جانب آگے بڑھ آیا اور اس نے جھک کر میرا بیگ اٹھالیا۔ میں نے بیگ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو وہ ایک قدم پیچھے ہوگیا۔ اس کی ہتھیلی اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی حرکات ذرا طنزیہ لگیں۔

'حسن صاحب، آیئے جناب، میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں' وہ ایسے تندہی سے بولا جیسے برا مان رہا ہو، لیکن میرا خیال ہے کہ میں نے اس کی آنکھوں میں تمسخر کی جھلک دیکھی۔ تم بھی جہنم میں جاؤ۔ اس نے محراب کی مخالف سمت ایک اور دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ وہ میرے آگے چل پڑا۔ اس نے مڑ کر یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ میں اس کے پیچھے آرہا

ہوں۔ ایک غریب مضافاتی لڑکے کے سامنے وہ سب بہت اونچے بن رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ میری آمد سے پہلے انھیں میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہوگا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ دبلا، اچھی تراش کا لباس پہنے شخص ملازم بھی ہوسکتا ہے۔ ملازم تو کام کے اوقات میں چیتھڑے لٹکائے پھرتے ہیں۔ وہ مجھے ایک چھوٹی راہ داری سے گزار کے لے گیا، جس کی دونوں جانب کمرے تھے۔ وہ دائیں جانب کے آخری دروازے پر رکا اور دروازہ کھول کر پہلے مجھے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

کمرا بہت کشادہ اور ہوادار تھا۔ سورج کی روشنی کھڑکی سے امڈی پڑ رہی تھی۔ سفید دیواروں اور سفید ہی فرنیچر سے کمرا صاف اور روشن لگ رہا تھا۔ میں اس قدر آرام اور خلوت سے مغلوب ہوگیا۔ میں نے جو باقی گھر دیکھا تھا اس کے بعد مجھے ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے تھا، لیکن میں نے تو کبھی ایسے کمرے میں سونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ بستر ایک کونے میں لگا ہوا تھا اور اس کے پائنتی ایک بڑی الماری۔ بستر کے مقابل ایک میز اور کرسی رکھی تھی۔ کھڑکی کے نیچے آرام کرسی کے پاس ایک مطالعے کے لیے لیمپ رکھا ہوا تھا۔

'شکریہ' میں نے کہا

'یہ ہی سب سے بہترین مہمان کمرا ہے، مجھے امید ہے کہ یہ آپ کو پسند آئے گا' وہ بولا۔ 'اگر آپ غسل کرنا چاہیں تو میں آپ کا سامان کھول دیتا ہوں۔'

یہ کہہ کر اس نے میرے بیگ پر نظر ڈالی، جو وہ اب بھی اٹھائے ہوئے تھا۔ 'نہیں، نہیں' میں نے احتجاج کیا، وہ ذرا ٹھٹک گیا۔ 'دراصل میرے پاس کھولنے کے لیے زیادہ سامان ہے ہی نہیں' میں نے سمجھایا۔ وہ منتظر رہا۔ ابھی اس کا دل نہیں بھرا تھا، ابھی اس نے کافی شرمندہ نہیں کیا تھا۔

'یہ بہت چھوٹا سا بیگ ہے' میں نے کہا

'جی جناب' اس نے یہ کہہ کر میرا بیگ نیچے رکھ دیا۔

'بہت شکریہ' میں نے اسے راستہ دکھایا

وہ تعظیم کو جھکا۔ وہ جھکا! 'اگلا دروازہ غسل خانے کا ہے' وہ دروازے کے قریب سے نرمی

سے بولا 'میرا نام علی ہے۔' اور میں چنگیز خان ہوں، کیسے ہو تم؟ میرا خیال ہے کہ علی اس کی غلامانہ عرفیت رہی ہوگی۔ اس کا سرکاری ٹائٹل۔ 'اگر آپ کو کچھ بھی درکار ہو تو مجھے آواز دے لیں۔ حسن صاحب، مجھے امید ہے کہ آپ کا ہمارے ساتھ قیام خوش گوار رہے گا۔'

اس نے دھیرے سے دروازہ بند کر دیا۔ یقیناً دروازہ ہمارے درمیان حائل ہوتے ہی اس کے چہرے پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی ہوگی۔ میں بند دروازے کی جانب تعظیم میں جھکا، اور کوئی فحش اشارہ کرنا چاہتا تھا مگر میرا دل نہ مانا۔ میں بھی شاید یہی کرتا۔ میں نے ایک صاف قمیض نکالی اور اپنا بیگ الماری میں رکھ دیا۔ ان دھندلی آنکھوں کو تمسخر کا موقع دینے کے لیے مجھے بیگ خالی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں قمیض بستر پر رکھ کے غسل خانے کی تلاش میں نکل گیا۔

غسل خانہ میری ہر امید پر پورا اترا۔ میں نے اپنی ربڑ کی چپل اتاری اور نیلے ٹائل پر ننگے پاؤں چلنے لگا۔ میں نے جراثیم کش مائع کی خوش بو سونگھی۔ کھڑکی کے اوپر لگا کھینچنے والا پنکھا آزما کر دیکھا۔ جب تک ٹب میں پانی بھرتا، میں نے شیشہ لگی چھوٹی الماریوں کی مکمل تلاشی لی۔ مجھے یقین تھا کہ میں فضا میں ہلکی موسیقی بھی سنوں گا۔

خواجہ احمد بن خلیفہ دوپہر کھانے کے لیے گھر آئے

میں بستر میں لیٹا اپنی مہمان داری کا لطف اٹھا رہا تھا۔ افسوس کر رہا تھا کہ میں نے علی سے اس کا اصلی نام چھین لیا، جب دروازے پر دستک نے مجھے آقا کی آمد کے بارے میں خبر دار کیا۔ میں نے اپنی صاف قمیض پہنی۔ آئینے کے سامنے مختلف مسکراہٹوں کی مشق کی۔ ان میں سے زیادہ عاجز منتخب کی، اور ایک مستقبل کی تلاش میں نکل گیا۔

علی مجھے کمرا عام سے گزار کے باغ میں لے گیا، اس نے خود ایک جانب ہو کر مجھے پہلے گزرنے دیا۔ میں شیشوں والے کھلے دروازے سے باہر چبوترے پر آ گیا۔ جب میں چند قدم سیڑھیاں اتر کے باغ کی جانب بڑھا، تو ایک خنک ہوا کا جھونکا میری جانب آیا اور مجھے سونگھ کے آگے بڑھ گیا۔ درخت اور جھاڑیاں ایک لمحے کو کانپیں اور پھر ساکت ہو گئیں۔ مجھے ایک

پستہ قد، اچھے بدن کا آدمی، ایک درخت کے نیچے کھڑا لڑکی سے باتیں کرتا نظر آیا۔ میری پشت پسینے سے شرابور تھی، اور ہاتھ ہلکے سے کپکپا رہے تھے۔ مجھے خوف تھا کہ میں اپنے آپ کو شرمندہ نہ کرا بیٹھوں۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ اپنی گفتگو میں ایسے محو تھے کہ میری آمد سے بے خبر رہے۔ میں ان سے چند قدموں کے فاصلے پر رک گیا اور ایک لحظہ انتظار کے بعد مڑ کے باغ سے لطف اندوز ہونے لگا۔۔ ظاہر ہے کہ مجھے انتظار کرایا جا رہا تھا۔ باغ میں چاک سے حاشیے کھنچے ہوئے تھے، جو سورج اور بارش کے ہاتھوں اب اپنی رونق کھو رہے تھے، مگر اب بھی صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ کانٹے دار بوگن ولا پر پھولوں کا اژدھام آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ گہرے سرخ، عنابی، پیتل اور ہلکے گلابی رنگ کے پھول۔ ٹیرس کے نیچے گل خیرو کے بڑے جھاڑ تھے، ان کے موی پھول زمین کی سمت جھک رہے تھے۔ یاسمین اور گلاب کی جھاڑیوں کی رو بارڈر کے ساتھ باڑ تک دوڑ گئی تھی۔ باغ کی ایک جانب پوری لمبائی میں بوگن ولا سر اٹھائے کھڑے تھے۔ خود اپنی شاخوں پہ بل کھاتی ایک گھنی سرحد کھینچ دی تھی۔ باڑ کی تار کے ساتھ ساتھ چکوترے کی جھاڑیاں باغ کی ترائی میں پھیلی ہوئی تھیں۔ شاخوں سے بھاری، پیلے درخت لٹک رہے تھے، جو پرندوں کی چونچوں سے گدرائے ہوئے تھے۔ میں وہاں پسینے میں شرابور دھوپ میں کھڑا اپنے آپ کو بے وقوف محسوس کر رہا تھا۔

مجھے احساس کہ وہ میری جانب مڑ گئے ہیں، اچانک کسی نے گہری سانس لی ارے یہ تم ہو، میں نے تمھیں وہاں کھڑے دیکھا ہی نہیں عزیزی۔۔۔ میرے خیال میں گہری سانس کا یہی مطلب تھا۔ میں ان کی جانب بڑھا۔ میرا ہاتھ سامنے تھا، چہرے اور آنکھوں میں ایک خوش گوار مسکراہٹ سجی تھی۔ میری جانب سے کوئی منہ بسورنا نہیں ہوگا۔ میں تو وہاں دل لبھانے آیا تھا۔ بوانا احمد بن خلیفہ مجھ سے ملنے آگے بڑھے، چھوٹے، نپے تلے قدم وہ جان بوجھ کر اپنا وقت لے رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک محظوظ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ میرے خیال میں یہ وہ مسکراہٹ ہے جسے وہ اپنے غریب بھانجوں کے لیے مخصوص رکھتے تھے۔ ان کے بالوں میں کچھ چاندی اتر آئی تھی۔ اور ان کی تراشیدہ مونچھوں میں بھی سفید اسٹیل کی لکیریں جھانک رہی تھیں۔ میں اپنے کھلے بازوؤں سے ان کی جانب لپکا، انھیں بہت عزت سے بوسے دیے، اس

ولولہ انگیزی میں میری سانس پھول گئی تھی، میں نے ان کا ڈھیلا بازو انھیں واپس لوٹا دیا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ میں اس نمائشی خاکساری پر خوش ہو رہا تھا۔ میں اپنے چہرے پر مسکراہٹ محسوس نہ کر سکا۔ شاید عضلات سکڑ کے اپنی آزردہ شکل میں واپس آ چکے تھے۔ میں نے زور لگا کے اپنے ہونٹ دوبارہ وا کیے، اور اچھا تاثر دینے کے لیے ایک خوش مزاج منہ بنایا۔ وہ دونوں میری اس مسخرگی پر بہت کھل کے ہنسے۔

'اچھا' میرے ماموں احمد بن خلیفہ بولے، ان کی بہن یقیناً انھیں دیکھ کر فخر محسوس کرتیں کہ کیسے اچھے نکلے ہیں۔ ان کی طاقت و وجاہت کے مشکِ عنبریں سے لطف اٹھاتیں۔ مجھے موئی یاد آیا اور اسٹالن کے لیے اس کی دعائیں بھی۔

'صحیح پہنچ گئے تھے، سفر اچھا کٹا؟'

کیا ان کی آواز میں ذرا سا تاسف جھلک رہا تھا؟ کیا انھیں امید تھی کہ وئی (Voi) کے شیر مجھے پھاڑ کھائیں گے؟ کیا ان کا خیال تھا کہ غلاموں کے سفید فام تاجر مجھے پکڑ کے چابک ماریں گے، ایمسٹرڈیم کی جنسی دکانوں پر پہنچا دیں گے؟ ابھی میں نے جس ہاتھ سے مصافحہ کیا تھا وہ ابھی انھوں نے جسم سے ذرا دور رکھا ہوا تھا کہ کہیں ان کے کپڑے آلودہ نہ ہو جائیں۔ انھوں نے دیکھا کہ میں ان کے ہاتھ کی جانب متوجہ ہوں تو انھوں نے اسے اپنی پتلون کی جیب میں ڈال دیا۔ انھوں نے اپنی جیکٹ کے بٹن کھول دیے، اور اپنی پتلون کی کریز ٹھیک کرنے لگے۔ کچھ دیر وہ اپنی نفاست سے ترشی مونچھوں سے کھیلتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی ایک خفیف سی محظوظ مسکراہٹ تھی، لیکن ایک جھلاہٹ کے ساتھ، ان کا چہرہ پھر بھی مسکرا رہا تھا۔ اب وہ مسکراہٹ میری سمجھ میں آتی ہے، صابر و پر اعتماد۔ لڑکی کی جانب مڑ کر انھوں نے اپنی بھنویں اچکائیں، وہ کھل کے مسکرا دی، وہ ہم دونوں کو دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ کیا ان کے خیال میں، میں اندھا تھا؟

'بھئی اب اس دھوپ سے اٹھ جانا چاہیے۔ چل کر دیکھیں کہ باورچی نے دوپہر کے کھانے کے لیے کیا بنایا ہے؟' انھوں نے پوچھا 'تمھاری والدہ کیسی ہیں، اچھی تو ہیں؟' وہ ہمارے آگے چل دیے۔ پیچھے مڑ کے محتاط، نپے تلے جملے بھی بولتے رہے۔ یہ آدمی نمائشی

مسکراہٹوں سے قابو آنے والا نہیں تھا۔ وہ بہت تحکم مزاج تھے، اور مجھے یقین ہے کہ چیزوں کی ایک فہرست ہوگی جو ان کی موجودگی میں ممنوع ہوں گی۔ اور آداب وطریقوں ایک مکمل سلسلہ ہوگا جو ان کی ذاتی انا کی تسکین کے لیے مروج ہوں گے۔ میں ایک شیر کی کچھار میں، ایک عفریت کے غار میں گھس آیا تھا۔ وہ اشتعال انگیز مزاج کہاں تھا۔ میں پوری کوشش کرنے والا تھا کہ اس کا مظاہرہ نہ دیکھوں۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ یہ پرسکون، خود اعتماد، متمول شخص میرے والد کی طرح گالیوں اور طعن تشنیع پر بھی قادر ہے۔ وہ علم کے تصوراتی عشق سے مرعوب ہونے والے نہیں تھے۔ مجھے اس بات سے زیادہ کسی اور چیز سے خوشی نہیں ہوتی کہ میں اپنے باپ کے گھر کے برآمدے میں ۱۵ واٹ کے بلب کے نیچے سمٹ کر انسانی فکر کے گوہر دریافت کر سکوں۔ جناب مجھے تجسس کی کبھی نہ بجھ سکنی والی پیاس ودیعت ہوئی ہے۔۔ جب ہی میں کتابوں کا کیڑا ہوں۔

لڑکی ہم سے پیچھے رہ گئی تھی، میں رک گیا تاکہ وہ برابر آجائے، تو وہ رک گئی اور وہ بھی۔ وہ مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

'وہ کون سا درخت تھا تم جس کے نیچے کھڑی تھیں؟' میں نے پوچھا

لڑکی نے شانے اچکا دیے انھوں نے بھی سر ہلا دیا۔ اس سے مجھے کچھ طمانیت ہوئی۔ 'پھلوں کے موسم میں اس پر چھوٹے، کالے بیر آتے ہیں' وہ بولی۔ 'ان کا ذائقہ بہت ترش ہوتا ہے جیسے پھٹا دودھ۔ میں خود بھی جاننا چاہ رہی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ مالی کو علم ہوگا' اس کی آنکھیں بھوری تھیں، میں نے پہلے دھیان نہیں دیا تھا۔

'آؤ' بوانا احمد واپس گھر کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ انھوں نے ایک کیڑے کو جھاڑ کے ہٹایا پھر دھیرے سے کوئی دھن گنگنانے لگے۔ ان کے ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں کچھ تلاش کرنے لگے۔ انھوں نے اپنا بٹوا ایک ہاتھ میں پکڑ کر اپنا کوٹ اتار دیا۔ ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے میں حیرت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا، علم کا متلاشی۔

'کیا تم نے بتایا تھا کہ تمھاری ماں ٹھیک ہیں' انھوں نے گھر کے اندھیرے میں سوال کیا۔ لڑکی میرے پاس سے گزر کے اپنے باپ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ وہ اب بھی خاموش تھی،

شاید اپنی عادت سے مجبور۔ میں نے دیکھا کہ اس نے اپنا بن بازو والا بلاؤز بدل لیا ہے۔

'جی' میں نے کہا۔ وہ دونوں اچھے ہیں۔ شکریہ، انھوں نے اپنی بہترین خواہشات آپ کو بھجوائی ہیں۔'

گھر میں وہ اور بھی پستہ لگ رہے تھے، اور بنا جیکٹ کے فربہ بھی۔ علی نے ہماری موجودگی کا اطمینان کرنے کی خاطر محراب سے جھانکا۔ میرے ماموں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا ہم محراب سے گزر کے ایک چھوٹے، روشن کمرے میں پہنچ گئے۔ اس کا ایک دروازہ باورچی خانے میں کھلتا تھا۔ یہ بات مجھے اپنی حس شامہ سے پتا چل گئی۔ ایک بڑی بیضوی میز پر بھورا کپڑا بچھا ہوا تھا، اس پر چمک دار چمچے اور کانٹے لگے تھے۔ مجھے اسی بات کا اندیشہ تھا۔ گھر پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کانٹے استعمال کرنے والے لوگ ہیں، اور پھر وہ لفظ ڈیڈی۔

'آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے' میں نے کہا

بوانا احمد مسکرائے۔ 'اگر تم نہ چاہو تو یہ سب اوزار استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہی' انھوں نے دھاتی اشیا کی قطار کی جانب اشارہ کیا، 'علی کو ایسے ہی میز سجانے میں مزہ آتا ہے جیسے کوئی دعوت ہو رہی ہو چاہے وہ ہمیں محض سوپ ہی پلا رہا ہو۔'

وہ ایک گہری سانس لے کر میز کی صدر کرسی پر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے اسے ایک مثبت مسکراہٹ لوٹا دی۔ وہ نگاہیں نیچی کیے میرے مقابل بیٹھ گئی۔ میں ان کرسیوں کی نرمی اور ان کی پشت کی مضبوطی کے سوا ہر چیز کے لیے تیار تھا۔

مجھے آرام کرنے چھوڑ کر وہ دونوں شہر چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا سوچتا رہا کہ اگر اپنے گھر میں ہوتا تو اس وقت کیا کر رہا ہوتا۔ یہ صرف اپنی ہمت بڑھانے کی ایک کوشش تھی مگر اس سے مجھے گھر یاد آنے لگا۔ مجھے اپنی روانگی پر والدین کی بے قراری یاد آنے لگی۔ کیا وہ بھی اس وقت میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، متفکر ہوں گے، کہ میں اس وقت جہاں ہوں وہ جگہ کیسی ہے۔ میری کامیابی تصور میں لا رہے ہوں گے۔ میرے ماموں اور ان کی بیٹی کا رویہ مجھے ذرا طنزیہ محسوس ہوا تھا۔ میں بستر میں لیٹا ان سے اپنی پہلی ملاقات کا جائزہ لینے لگا۔

اپنے رویے میں استہزا تلاش کرنے لگا۔ اگر نظر آجائے تو اسے مستقبل میں اپنے رویے سے نکال دوں۔

میں سہ پہر میں کبھی نہیں سوتا تھا، اس دن سو گیا۔ جب علی مجھے جگانے آیا تو باہر اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میرے یہ کہنے کے باوجود کہ میں بیدار ہو گیا ہوں، وہ دروازہ بجاتا رہا۔

'اندر آجاؤ' میں چیخا۔ اس نے دروازہ کھول کے بجلی روشن کی اور دانت نکوسنے لگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا، کسی سازشی کی مانند مسکراتا مجھے ہاتھ سے اشارے کرنے لگا۔ اس تماشے کو مزید ڈرامائی بنانے کے لیے اس نے اپنے دونوں ہاتھ رگڑے اور خالی ہوا اپنے چہرے کی سمت پھیر دی۔ میں نے سر ہلا کے عندیہ دیا کہ میں سمجھ گیا ہوں کہ کھانا تیار ہے اور کیا میں اٹھ کر منہ دھو سکتا ہوں۔ کیا وہ نشے میں تھا؟ اس نے جاتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ اس کی کلائی کسی چھوٹے بچے کی مانند حرکت کر رہی تھی۔ اس نے مجھے گہری مسکراہٹوں سے نوازا اور پھر آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ میں جلدی سے غسل خانے کی جانب بڑھا۔ سہ پہر میں اتنی دیر تک سونے پر مجھے معلوم تھا کہ رات کو اب مشکل سے نیند آئے گی۔ میں شاید اپنی امید سے زیادہ تھکا ہوا تھا۔

میں نے دن میں تیسری بار قمیض تبدیل کی۔ مجھے سونے سے پہلے کچھ کپڑے دھونے پڑیں گے۔ ربڑ کی چپلیں کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ وہ مجھے دروازے کے باہر ملیں، انھیں توجہ سے صاف کیا گیا تھا اور اس کے لاڈ اٹھائے گئے تھے۔ اس کے ایک طرف کا پلہ مرمت ہو چکا تھا۔ اس کا چمڑا شفاف اور کسا ہوا تھا۔ انگوٹھے کی جگہ پر کالا سوراخ کسی بدنما داغ کی مانند کھلا ہوا تھا۔

وہ بڑے کمرے میں ارغوانی کرسیوں میں دھنسے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ریڈیو دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔ ماموں نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا اور مسکرا کے مجھے ایک کرسی تک لے گئے۔ انھوں نے ایک ڈھیلی، آدھی آستین کی قمیض زیبِ تن کر لی تھی۔ اس کی جیبیں تمباکو کی تھیلی اور پائپ سے سے ابھر آئی تھی۔

'خوب آرام کر لیا؟' وہ مجھ پر ہنسے 'سفر کی عادت نہیں [illegible]

اس سے زیادہ تھکا دینے والا ہوتا ہے!'

وہ مسکراتے ہوئے دوستانہ انداز میں میرے مقابل بیٹھ گئے۔ میں نے اپنے اچھے خیالات میں انھیں اسی طرح دیکھا تھا۔ ڈھیلی قمیض، ابھرا ہوا پائپ اور تمبا کو سمیت۔ ایک امیر تاجر کی خوش مزاجی سے کھلتی ہوئی تصویر۔ ریڈیو ان کے سر کے برابر رکھا ہوا تھا، انھوں نے ہاتھ بڑھا کے اسے بند کر دیا۔ وہ لڑکی اس پر چونکی لیکن اس سے پہلے کہ اس کی جھلاہٹ ظاہر ہو اس نے منہ پھیر لیا۔ انھوں نے پھر بھی دیکھ لیا اور اس کے پھرے ہوئے رخ کی جانب دیکھ کر مسکرائے۔ اس نے پھر کپڑے بدل لیے تھے۔ اب وہ ایک ڈھیلی، بالائی کے رنگ کی قمیض پہنے تھی۔ اس سے بہت سادہ اور مہنگے کھدر کا شبہ ہو رہا تھا، میں سمجھا کہ شاید ریشم ہے۔ وہ بہت پر سکون، خوب صورت اور با اختیار لگ رہی تھی۔ اس کا باپ اس کی جانب دیکھتا تو اس کی نظر میں فخر صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ وہ میرے جوتوں کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

'چینی ہیں' میں نے سوچا کہ شاید اس وضاحت سے ان کی خستہ حالی کا جواز پیدا ہو جائے گا

'اوہ' وہ بولی۔ وہ آگے جھک کر میرے جوتوں کو قریب سے دیکھنے لگی تو اس کی گردن میں تناؤ پیدا ہو گیا۔ میں نے اس کے سینے کی گولائیوں کی ایک جھلک دیکھی تو فوراً نگاہیں نیچی کر لیں

'آرٹ کا نمونہ ہے' وہ میری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو کر بولی۔

باپ بھی سنجیدہ توجہ سے آگے آئے 'یہ انگوٹھے کا سوراخ اس میں بنا ہوا آیا تھا، یا تم نے خاص طور پر بنوایا تھا؟'

میں بھی ان کی مسکراہٹ میں شامل ہو گیا۔ ان کی چھیڑ چھاڑ کو استقبال کا ایک طریقہ جانا۔ میں نے کوئی حاضر دماغ لیکن منکسر المزاج جواب ڈھونڈنا چاہا، لیکن محض اسی دکھ میں گرفتار رہا کہ میں بس جوتے کے متعلق گفتگو کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہوں 'یہ بہت خراب حالت میں ہیں، ہیں ناں۔ لیکن بہت اچھی قیمت پر مل گئے تھے'

'کیا وہاں گھر میں بہت سی چینی اشیا ہیں؟' انھوں نے پوچھا 'یہاں تو میں نے جو بھی چین کی بنی چیز دیکھی، ان کی کوالٹی بہت ناقص ہوتی ہے۔'

'یہ بہت سستے تھے'

'سستا روئے بار بار' ماموں اپنی حاضر جوابی پر مسرور ہو گئے

'تم نے اس کے لیے چاہے جتنے بھی پیسے دیے ہوں، میرے خیال میں وہ زیادہ ہی رہے ہوں گے۔' لڑکی کہنے لگی 'تمھیں چاہیے کہ یہ کسی کو دے دو' یہ بات اس نے مسکرا کے نہیں کہی تھی۔ بلکہ ایک لمحے کے بعد ذرا شرمندگی سے چہرہ دوسری جانب کرلیا۔ علی ہمیں کھانے پر بلانے آگیا۔ یوں میرے جوتے مزید تنقید سے بچ گئے۔ کھانا پہلے ہی میز پر سج چکا تھا، علی باورچی خانے کے در پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر احمقانہ مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔ احمد ماموں نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ملازم کچھ عجیب حرکتیں کر رہا ہے

'علی آج کیا مل رہا ہے؟' انھوں نے پوچھا۔ 'مجھے امید ہے تمھیں یاد رہا ہوگا کہ ایک مہمان بھی ٹھہرا ہوا ہے۔ تم نے کیا بنایا ہے ہمارے لیے؟'

یہ تو میں بھی انھیں بتا سکتا تھا۔ میں جب سے بیدار ہوا تھا میری ناک میں بریانی کی مخصوص خوش بو دھمال مچا رہی تھی۔ علی نے جواب نہیں دیا بلکہ مٹی کی بڑی پتیلی کے قریب پلیٹیں لگا دیں۔ جب ہم سب بیٹھ گئے تو اس نے ڈھکنا اٹھایا اور فاتحانہ نظروں سے ہم سب کو دیکھا

'یہ تو بریانی ہے' لڑکی نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

میں نے کوشش کی کہ میرے منہ میں جو پانی بھر رہا تھا، اس میں ڈوب نہ جاؤں۔ یہ سوانگ کس کے لیے رچایا جا رہا تھا۔ انھیں معلوم رہا ہوگا کہ بریانی پکی ہے۔ اس معزز پکوان کی خوش بو کون نہیں پہچانتا؟ علی نے چمچے بھر کے پلیٹوں میں کھانا نکالا۔ پیلے دانے پلیٹوں میں بلور کی مانند چمک رہے تھے۔ گوشت کی بڑی بوٹیاں چاولوں کے درمیان بکھری ہوئی تھیں، ان میں سے رس اور چربی ٹپک رہی تھی۔ میرے اصرار پر اس نے مجھے سب سے آخر میں دیا۔ میں نے اسے پلیٹ اتنی بھرنے دی کہ مزید مانگنے میں خدشہ تھا کہ بچکانہ مسخرگی سے بات لالچی گنوار کی حدوں میں چلی جائے گی۔ اس نے کسی مسرور باورچی کی طرح مجھ پر اپنے مسوڑوں تک کی نمائش کی۔ میرا ہاتھ چاول اور گوشت کے درمیان بھٹکتا، پھسلتا رہا۔ میں منہ بھر کے آہستگی سے چبانے لگا۔ اس گودے جیسے نرم گوشت کی لذت کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ علی کا منہ خوشی

سے کھلا ہوا تھا۔ میں نے شکم پری کی سانس لی تو وہ سب ہنس پڑے۔ علی نے انعام کے طور ایک اور بوٹی میری پلیٹ میں ڈال دی۔ اصلیت یہی ہے میں نے سوچا غریب رشتہ دار ایسا مسخرہ ہے کہ اسے احساس ہی نہیں وہ اپنے آپ کو کیسا بے شرم بنا رہا ہے۔ مضافاتی لڑکا شہر میں بحال کسی چیتھڑے جمع کرنے والے کی مانند ہر لذیذ غذا پر رال ٹپکا رہا ہے۔

'تمھیں پسند آیا؟' علی نے سر پرستانہ مسرت سے دریافت کیا۔ وہ کھانا کھلاتے وقت میرے برابر کھڑا رہا، میری بھوک کے بارے میں دریافت کرتا رہا۔ کھانے کی ترکیب کی تاریخ بیان کرتا رہا۔ اس میں پڑنے والے اجزا سے لے کر اس تیار پکوان تک کہ جو میرے مضافاتی شناخت کی دھجیاں بکھیر رہا تھا۔ میں نے خود کو یاد دلایا کہ زیادہ ہوشیار بھی نہ بنوں ورنہ وہ سمجھیں گے میں ان پر ہنس رہا ہوں۔ ہر تھوڑی دیر کے بعد علی چاولوں کے دانوں کے بیچ کوئی بوٹی ڈھونڈتا اور پھر ایک پر مسرت نعرے کے ساتھ اسے میری پلیٹ میں منتقل کر دیتا۔ میں اس لیے موٹا کیا جا رہا تھا کہ۔۔۔؟ میں جب بھی توقف کرتا تو وہ بے چین ہو جاتا، انتظار کرتا کہ میں دوبارہ شروع کروں۔

وہ کھانوں کے بارے میں قصہ کہانیوں سے گفتگو پر چھایا رہا۔ مجھے حیرت تھی کہ ماموں، اسے اتنا بولنے کی اجازت دے رہے تھے۔ میں سوچنے لگا کہ کیا یہ بھی کسی گنجلک مذاق کا حصہ ہے جو میں ابھی تک سمجھ نہیں پا رہا۔ علی اس وقت اس نخوت پرست ملازم سے بہت مختلف تھا جس نے ہمیں دوپہر کا کھانا کھلایا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید یہی اس کا اصلی روپ ہے۔ شاید پہلے میں نے جو تحیر آمیز شخص دیکھا تھا وہ اپنے فسردہ خیالات اور افسوس ناک امیدوں کا شکار ہو کر رہ گیا تھا۔ جس طرح وہ میرے برابر کھڑا گفتگو کا شیرازہ بکھیر رہا تھا، وہ ایک بے قابو سا عمل تھا۔ لیکن بوانا احمد نے کسی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بلکہ وہ مسکرا کے دل چسپی اور لطف سے علی کی پیشکش سے محظوظ ہوتے رہے۔

میں نے سنا کہ وہ اپنی بیٹی کو سلمیٰ کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ خوب صورت بھوری آنکھوں والی سلمیٰ! یہ بات اپنی جگہ اہم تھی کہ مجھے اس کے نام سے متعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ اسے میرے سامنے اتنا غیر اہم نہیں کیا گیا کہ میں اپنے موڈ کے مطابق جس طرح چاہوں

مخاطب کروں۔ وہ بہت کم بولی۔ وہ گفتگو کا اپنی آنکھوں سے تعاقب کرنے پر قانع تھی۔ وہ میری مسخرگی سے لطف اندوز ہونے کے لیے متوجہ ضرور تھی، لیکن ایک محتاط انداز سے، جیسے فاصلہ رکھنا چاہ رہی ہو۔ ہونٹوں پر کبھی کبھار ایک مسکراہٹ دوڑ جاتی، جیسے کوئی ایک تھکا دینے والے بچے کو کھیلتا دیکھ رہا ہو۔ جب میری بسیار خوری آسودہ ہو چکی تو میں اس شام اپنی کارکردگی پر شرمندہ، کرسی پر پیچھے ہو گیا۔

'اب معلوم ہوا کہ امیر ہونے کا کیا لطف ہے' میں نے ہنستے ہوئے اپنے میزبان سے کہا۔

یہ غلط جملہ تھا۔ بے وقار اور الزام تراشی کا شائبہ لیے ہوئے بوانا احمد ناخوشی سے مسکرا دیے۔ اپنی غربت کے اعلان پر سلمٰی نے میری جانب ایسے دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ ہوا میں انقلاب کی خوش بو سونگھ کر، اس فقرے نے تمھیں بیدار کر دیا ناں، لاڈلی؟ بالآخر علی میرے پاس سے ہٹا تب مجھے احساس ہوا کہ میرے کندھے پر اس کی موجودگی نے مجھے کتنا کشیدہ کر دیا تھا۔ میں نے دوبارہ سلمٰی کی جانب دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ ابھی تک میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے شرمندگی سے بوانا احمد کی طرف دیکھا، وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اس کی نگاہیں جیسے ہی ان سے چار ہوئیں، اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی، اس نے نگاہیں نہ ہٹائیں، بلکہ سر اٹھا کے دیکھنے لگی جیسے پہلے وہ میرے ساتھ کر چکی تھی۔ میں نے یہ مختصر ڈرامہ ذرا تشویش سے دیکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماموں میری جانب سے مشکوک ہوں۔ بظاہر اس کی کوئی وجہ تھی بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ میری وجاہت اور طلسمی شخصیت ابھی سے اس کے دل کو زخمی تو نہیں کر چکی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے بے ضرر اور بے وقوف نوجوان سمجھیں۔ ایک احمق جو فقط ان کی فیاضی کے لائق تھا۔ ۔ یقیناً خطرے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ لڑکی پھر میری جانب مڑ گئی اور کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں غصے سے شعلہ بار تھیں۔ انھوں نے ہلکے سے قہقہے سے پسپائی کا خفیف سا عندیہ دیا۔ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے، اس نے ان کی جانب مجروح نظروں سے دیکھا۔ میں سوچنے لگا کہ ان کے خیال میں، میں یہ سب کس طرح دیکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنے والد کو اس طرح سے پسپائی کا اشارہ دیتے ہوئے تصور کرنے کی کوشش

کی۔ مگر یہ تصور اتنا مضحکہ خیز تھا کہ میں اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔ ان دونوں نے میری جانب دیکھا۔ میں ان کی آنکھوں کی تحریر سے سمجھ گیا کہ ان کے خیال میں، میں ان پر ہنس رہا ہوں۔

'کیا تم ہمارے ساتھ زیادہ دن ٹھہرو گے؟' سلمٰی نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا ۔ میں نے اس امید میں بوانا احمد کی جانب دیکھا کہ ان سے اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ اشارہ مل جائے۔ وہ مڑ کر باورچی خانے کے دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔

'کیوں نہ ہم بیٹھک میں چلیں۔ جب اسے یاد آئے گا تو علی کافی وہیں لے آئے گا۔ آؤ چلو۔'

جب وہ میز سے اٹھے تو انھوں نے میرے ہاتھ کی جانب دیکھا جو گھی اور زعفران سے سنے ہوئے تھے۔ انھوں نے چمچے استعمال کیے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے حقارت کے آثار نمودار ہوئے۔ 'معاف کیجیے گا' میں بولا اور تیزی سے ہاتھ دھونے غسل خانے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور سوچنے لگا کہ مجھے مزید کتنے روز بوانا احمد بن خلیفہ کے مکان اور گھر کی مہمان داری برداشت کرنی پڑے گی۔ جب میں لوٹا تو وہ علی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے:

'وہ آپ کو پسند کرتا ہے' سلمٰی بولی 'آپ حمایت میں تھے، میرے خیال میں تو۔۔۔۔'

'اب دوبارہ افیون پینے لگا ہے' بوانا احمد بے صبری سے بولے 'وہ ہر شام پیتا ہے۔'

علی کافی لے کر اندر داخل ہوا، وہ جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔ وہ جلدی سے سینی میز پر رکھ کے بغیر کچھ کہے لوٹ گیا۔ باپ بیٹی میں نظروں کا تبادلہ ہوا۔ بوانا احمد سر ہلانے لگے۔ 'یہ اب جا کر اپنی بیوی کی پٹائی کرے گا۔ جب بھی کچھ نیا ہوتا ہے۔۔۔ مثلاً آج تمھاری آمد۔۔۔۔ تو وہ زیادہ پی کر احمقانہ حرکتیں کرتا ہے، پھر اپنی بیوی کی پٹائی کرتا ہے، بچاری عورت۔ انھیں بس اتنا ہی آتا ہے۔ افیون، عورت اور مار پیٹ، پھر ان کا خیال ہے کہ یہ ملک چلا سکتے ہیں۔'

سلمٰی نے اٹھ کر کافی انڈیلی 'سیاہ یا سفیدی کے ساتھ؟' اس نے انگریزی میں پوچھا۔ میرے چہرے پر یقیناً اچنبھے کے آثار نظر آئے ہوں گے، وہ شاید یہ یاد کر کے مسکرائی کہ صبح میں نے اپنا تعارف کیسے کرایا تھا 'تم کافی میں دودھ لوگے؟'

'نہیں شکریہ' میں ہچکچا کے بولا۔ میں ایک اور امتحان میں فیل ہونا نہیں چاہتا تھا۔
'پی کے دیکھو' احمد ماموں نے اصرار کیا 'دودھ اور شکر کے ساتھ کافی بہت مزیدار ہوتی ہے۔ تمھاری ساحلی علاقوں کی کڑوی کافی سے بہت مختلف۔ پی کے تو دیکھو۔ سلمیٰ، دو اسے تھوڑی سی۔' اس نے ایک گدلا، بدمزہ مشروب پکڑا دیا۔ میں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور گھونٹ بھر کے تعریفی انداز میں گنگنانے لگا۔ وہ مسکرادی، جب کہ اس کے والد نے آسمان کی جانب نظریں بلند کیں، جیسے میری جہالت پر شاکی ہوں۔

وہ اٹھ کر میری کرسی کے عقب میں کوئی کتاب منتخب کرنے لگی۔ میری کرسی کے عقب میں کھڑی وہ دھیرے دھیرے اوراق پلٹنے لگی۔ وہ سادگی سے معمول کا یہ عمل دہرا رہی تھی لیکن میں اس کی قربت سے مسرور تھا۔ وہ کرسی پر لوٹ آئی اور اسے مزید روشنی کے رخ پر ذرا ترچھا کر کے وہ اپنے مشغلہ میں مگن ہوگئی۔ جہاں میں بیٹھا تھا وہاں سے کتاب کا عنوان 'منتخب میدانی علاقے' نظر آتا تھا۔ اس نے کتاب اپنے مڑے ہوئے گھٹنوں پر پھیلا لی۔ اور تھوڑی کے نیچے ہاتھ کا سہارا دے کر اس میں کھوگئی۔ بوانا احمد اپنے سامنے کی جانب دیکھتے ہوئے نیم وا ہونٹوں سے کوئی بے سری سیٹی بجاتے رہے۔ پھر اچانک کسی جذبے کے تحت اٹھ کر ریڈیو کھول دیا۔ وہ کتابوں کے ایک ڈھیر میں سے ایک تصویری البم نکال لائے۔ وہ انھوں نے بغیر کچھ کہے ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ مجھے پکڑا دیا۔ بقیہ شام ہم نے وہ تصویریں دیکھتے ہوئے گزار دی۔ اس میں سلمیٰ کی ماں کی کوئی تصویر نہیں تھی اور بوانا احمد نے ان کا کوئی تذکرہ بھی نہیں کیا۔

ابھی رات بھیگنا شروع ہی ہوئی تھی کہ سلمیٰ نے سونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ دھیرے سے شب بخیر کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ اسے جاتا دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ وہ اپنی کرسی میں خاموش بیٹھی ہوئی بھی راحت کا باعث تھی۔ اس کے جانے کے بعد مجھے بھی اپنی جماہیاں چھپانے میں دشواری ہونے لگی۔ آخر بوانا احمد نے معذرت چاہی کہ اتنے طویل سفر کے بعد انھوں نے مجھے اتنی رات گئے تک بیدار رکھا، اور اصرار کیا کہ میں بھی سو جاؤں۔ وہ اپنا تصویری البم تھامے، اپنے پائپ کی تلاش میں نکل گئے۔

سورج کی کرنیں میرے پپوٹوں پر بھاری ہونے لگیں تو میری آنکھ کھل گئی۔ ایک کھڑکی

کھلی ہوئی تھی، اور میں نے مرطوب ہوا کا لطف لیا۔ میں جس طرف کروٹ بدلتا بستر نرم اور آرام دہ تھا۔ چادر میں ابھی تک نئے پن کا کلف تھا اور خوش بو کا خفیف سا احساس۔ کھڑکی کی جالی سے کسی پرندے کی دھیمی سی چہچہاہٹ سنائی دی۔ باہر لگے ہرے درختوں کے رس کی خوش بو سے فضا معطر تھی، مجھے اٹھنے میں کسل مندی تھی۔ میں ابھی تک اس خواب میں ہلکورے لے رہا تھا جس سے بیدار ہوا تھا۔

کھڑکی پر لگی جالی سورج کی راہ میں مزاحم تھی۔ روشنی کو پورے کمرے میں بکھیر کے اسے اور طلسماتی رنگ دے رہی تھی۔ میں نے کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔ ایک گاڑی نزدیک آنے لگی، گھر کے سامنے شور مچا کے تیزی سے گزر گئی۔ مجھے لگا کہ میں اسی طرح مستقل لیٹا رہ سکتا ہوں، اس کام کو بھول کے جو مجھے اس مقامِ مقدسہ تک لایا تھا۔

میں بوانا حمد سے پیسے مانگنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنا اندازہ میں کر چکا تھا کہ وہ مجھے کچھ نہیں دینے والے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے حقیر سمجھتے ہیں۔ میرے کسی جملے یا رویّے کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس مقصد کی وجہ سے کہ جو مجھے وہاں لے گیا تھا اور جو میں تھا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ میز پر میری مسخریوں سے کوئی بھی مثبت یا منفی اثر پڑا تھا، سوائے اس کے کہ شاید وہ میری جانب سے مشتبہ ہو گئے تھے۔ میں نے جو کہا اس میں سلمٰی کی دل چسپی پر وہ اس لیے غصہ نہیں ہوئے تھے کہ انھیں اس کی عصمت کا خوف تھا، نہ ہی یہ خوف تھا کہ در پردہ میں اپنی امیر ماموں زاد سے تعلق پیدا کرنے وارد ہوا ہوں۔ اگر انھیں یہ خوف ہوتا تو وہ فوراً مجھے روانگی کے لیے کہتے۔ میرے خیال میں وہ ایک تناؤ کی مسترد فضا برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ وہ مہمان نوازی اور درستگیٔ عمل کے خواہاں تھے۔ لیکن وہ راستے بند کر دینا چاہتے تھے جن پر چل کر میں وہ مدد طلب کر سکوں جس کے لیے میں یہاں آیا تھا۔ میرا نہیں خیال کہ یہ سب کسی منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ لیکن میں یہ تصور کر سکتا تھا کہ بوانا احمد سلمٰی سے کہہ رہے ہوں گے یہ یہاں پیسے مانگنے آیا ہے، لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی مت کرنا۔ اور میں یہ بھی تصور کر سکتا تھا کہ سلمٰی نے اپنے مطمئن اور باوقار انداز میں ایک دیہاتی لڑکے کو اس کے مقام پر پہچاننے کا سوچا ہوگا۔ انھوں نے سادگی سے منع کیوں نہیں کر دیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر میرے ماموں زیادہ

دشوار ثابت ہوئے تو مجھے یاد دلانا ہوگا حال آں کہ اس بات کو چھیڑتے ہوئے بھی مجھے دکھ ہو رہا ہے میرے دوست اپنی والدہ کی وراثت کے بارے میں۔ حال آں کہ ان کی واضح برتری کو دیکھنے کے بعد میرا نہیں خیال کہ میں ایسا کرنے پر قادر تھا۔ شاید وراثت کی وجہ ہی سے انھوں نے مجھے مدعو کیا تھا شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا یہ اب بھی ایک مسئلہ ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا میں یہ مسئلہ اٹھاتا ہوں۔ میں سوچ سکتا تھا کہ ایسا کوئی بھی خیال وہ کتنی حقارت سے مسترد کر دیں گے۔ غریب رشتے دار کوئی مدد مانگنے نہیں آیا بلکہ وہ تو کسی مفروضہ وراثت میں حصے کا طلب گار ہے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاید میں ان سے زیادتی کر رہا ہوں۔ وہ میرے والد کے خط کے جواب میں اور کیا کرتے؟ شاید انھوں نے سوچا ہوگا کہ میں تعطیلات کا لطف لوں گا میں اس خیال سے ہی شرمندہ ہونے لگا کہ میں انھیں کتنی زحمت دے رہا ہوں۔ میں باعث شرم ساری تھا۔ اور مسخرگی کے کارن وہ مجھ پر رحم اور حقارت کے ملے جلے احساسات کا شکار تھے۔ وہ اس سے بھی زیادہ برا سلوک کر سکتے تھے، مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اگر مجھے یقین ہو جاتا کہ میرے والدین مجھے احمق نہیں سمجھیں گے تو میرے خیال میں، میں بخوشی لوٹ جاتا۔

میں باورچی خانے گیا تو وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کو ایک نیلاہٹ مائل رنگ سے بہت آب و تاب سے روغن کیا گیا تھا۔ دیواروں سے برتنوں کی الماریاں ٹیک لگائے کھڑی تھیں۔ ایک کھڑکی کے نیچے المونیم کا سنک چمک رہا تھا۔ دو اونچے فرج عقبی دروازے سے ذرا پہلے سر جوڑے کھڑے تھے۔ میں ہر چیز کی صفائی اور ترتیب کو سراہے بغیر نہ رہ سکا۔ جب ہمارے گھر کے عقب میں واقع دو دِ سیاہ سے رنگے غار کو مقابلے کے لیے پیش کیا تو میں مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ مجھے اس گھر میں کاک روچ نظر نہ آنے پر حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھاتے بھی کیا؟ مجھے غذا کا ایک بھورا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

کھڑکی کے پاس ڈھکنے لگے شیشے کے مرتبان رکھے تھے۔ جو اسکول کی لیبارٹری بچوں میں نمونے کے مرتبانوں کی قطار یاد دلا رہے تھے۔ جن کے گدیالے سرکے میں لاشوں کے اچار پڑے ہوتے تھے۔ میں نے سوچا شاید برتنوں کی الماری میں تلاش سے کچھ روٹی مل

جائے۔ مجھے ایک کافی کا ڈبا نظر آیا۔ میں چار خانوں والی فارمیکا کی نیلی رنگت والی میز پر پانی ابلنے کا منتظر تھا جب عقبی دروازے سے علی داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اس نے مجھے سرد مہری سے دیکھا۔ وہ اپنی حیرت میں یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ کس قسم کا رویّہ رکھنا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ تذبذب میں ہے کہ میری موجودگی پر برہمی کا اظہار کرے۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔

'اور بریانی چاہیے؟' وہ بولا

اس نے مجھے ناشتے میں انڈے پیش کیے۔ وہ ایک پرانی گھٹنوں تک کی چست جانگیا پہنے تھا، ساتھ ایک ٹینس کی پرانی قمیض۔ اس کی پنڈلی کی پشت پر ایک بہت لمبے گھاؤ کا نشان تھا۔ وہ اپنے بائیں پیر پر پورا وزن نہیں ڈالتا تھا۔ وہ میرے اطراف میں ہی مصروف ہوگیا۔ جس برتن میں پانی چڑھایا تھا، وہ اس نے خالی کیا، اور ایک کیتلی میں پانی بھرا۔ وہ ایک الماری سے انڈوں کا ڈبا نکال لایا اور پوچھنے لگا کہ میں گائے کی آنکھ والا انڈا پسند کروں گا یا خاگینہ۔ گائے کی آنکھ والا، اس نے سمجھایا، وہ تلا ہوا انڈا تھا جس کی زردی سلامت رہے۔ میرے لیے انڈے کھانا ایک شاذ و نادر لذت تھی، میرے منہ میں پانی بھر آیا۔

'وہ شہر گئے ہوئے ہیں' وہ میری طرف مڑ کے مسکرایا۔ 'انھوں نے انتظار کیا تھا لیکن آپ سو رہے تھے۔ آپ کو سونا بہت پسند ہے ناں۔ اب خاصا دن نکل آیا ہے۔ ہفتے میں دو دن سلمیٰ صاحبہ کام پر جاتی ہیں اور بوانا کو تاخیر پسند نہیں۔' وہ پھر مسکرا دیا۔ جیسے میرے بستر نہ چھوڑنے کو سمجھ رہا ہو مگر درگزر پر آمادہ نہ ہو۔ 'سفر یقیناً تھکا دینے والا رہا ہوگا۔' وہ بولا۔ میرے خیال میں وہ چالیس کے لگ بھگ رہا ہوگا۔ دبلا، سوکھا سا۔ اس کے محتاط رویّے نے اسے ایک قسم کا وقار عطا کر دیا تھا۔ یہ میرے خیال کے احاطے میں بھی نہ آسکا کہ وہ اپنی بیوی پر تشدد کرتا ہوگا۔ اس وقت تو وہ مظلوم، شکست خوردہ شخص دکھائی دے رہا تھا جو ایک ایسے مہمان کی خاطر داری کر رہا تھا کہ جسے نظر انداز کرنے کی اسے اجازت تھی۔ وہ بہت مزے میں انڈا تل رہا تھا۔ مجھے ایک ایسے مہمان کے لیے انڈا تلنے سے زیادہ اور کوئی کام محبوب نہیں جو گیارہ بجے تک بستر سے ہی نہ نکلے۔ مجھے ہر تھوڑی دیر کے بعد اس کے چہرے کی جھلک نظر آتی۔ وہ، پسینے میں شرابور چکنے، توے کو انہماک سے دیکھ رہا تھا۔

'میں کبھی ساحل پر نہیں گیا' وہ بولا 'سنا بہت ہے۔ حال آں کہ محض ایک ہی روز کے سفر پر ہے لیکن مہلت ہی نہیں ملتی۔ کیا میں آپ کا انڈا پلٹ دوں۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا ناشتا کھانے کے کمرے میں لاسکتا ہوں۔' اس نے انگریزی اور کسواحیلی کی ملی جلی زبان استعمال کی۔ جس میں کسواحیلی کا عنصر زیادہ تھا۔

'میں یہیں کھالوں گا' میں نے تجویز کیا 'اگر کوئی حرج نہ ہوتو۔ کچھ روٹی مل سکتی ہے؟'

'اوہ' وہ بولا اور تیزی سے بڑھ کے کیتلی کا چولہا بند کر دیا ایک کافی انڈیل کے اس نے میرے سامنے رکھ دی۔ اس نے ڈبل روٹی کا ایک سلائس کاٹ کر بھی میرے سامنے رکھ دیا، اور پھر مجھے انڈے پیش کیے۔ 'میں نے بہت کچھ سنا ہے' اس نے اپنی گھنی بھنوؤں کے نیچے سے مجھے دیکھا 'دل چسپ باتیں' اس نے تسلی اور شفقت کے انداز میں کہا اور ہٹ کر سنک کی جانب چلا گیا۔

انڈے بہت لذیذ تھے۔ علی نے کافی میں دودھ ملا دیا تھا۔ میں ہتھیار ڈال کے اس کے گھونٹ لینے لگا۔ 'میں نے سنا ہے کہ ساحلی علاقوں کے لوگ بہت بااخلاق ہوتے ہیں' وہ ایک چاپلوسانہ مسکراہٹ نچھاور کرتے ہوئے بولا۔ میں ہنس پڑا۔ اس کا چہرہ متغیر ہوگیا، جیسے اس میں کوئی اندرونی درد جھلک آیا ہو۔

'لوگ تو ایسے ہی باتیں بناتے ہیں' میں سمجھا کہ شاید میں نے اسے دکھ پہنچایا ہے

'لیکن یہ سچ ہے ناں؟'

'یہ انڈے بہت لذیذ ہیں'

'یہ اچھی بات ہے' وہ غائب دماغی سے بولا 'میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہہ رہا تھا کہ لوگ بہت شائستہ ہوتے ہیں۔ کہہ رہا تھا وہ کبھی بدتمیزی یا غنڈہ گردی نہیں کرتے' میں سمجھا کہ شاید یہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔ بہت سی چیزوں کا ذکر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً ساحلی باشندوں سے ملا ہوگا۔ اسے یقیناً معلوم ہوگا کہ اس کا دوست بڑھا چڑھا کے بتا رہا ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ تھا کہ ساحلی باشندے غیر ملکی ہوتے ہیں اور وہ میری تسلی کی خاطر یہ مہربان جملے کہہ رہا تھا کہ غیر ملکی کتنے بہتر ہوتے ہیں۔

'کیا تمھارا دوست ساحلی علاقوں کا باشندہ ہے؟' میں نے پوچھا

'نہیں' وہ ایسے ہنسا کہ جیسے کسی بحث میں میری بات پکڑ لی ہو۔ 'نہ، نہ، نہ۔۔۔ وہ تو ٹرورو میں رہتا ہے۔ وہ ساحلی علاقوں میں بہت سال رہا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کچھ آوارہ گرد بھی ہوتے ہیں' اس نے جیسے کسی معمولی نقص کا روا روی میں ذکر کیا ہو'لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ اصلی ساحلی لوگ مختلف ہوتے ہیں، مہذب اور مہربان۔'

'میرا خیال ہے کہ تمھارا دوست جھوٹ بول رہا تھا' میں بولا

اس کے ماتھے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ذرا کھنچ گیا ہے۔ پھر وہ دوبارہ میری جانب مڑا 'آپ کہہ رہے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہوگا۔ اب اس کی آنکھوں میں کینہ اتر آیا تھا' وہ کچھ خراب باتیں بھی کر رہا تھا' وہ کچھ ہچکچایا بظاہر مجھے دکھانے کے لیے کہ وہ بے یقینی کا شکار ہے۔ لیکن اصل میں وہ احتیاط برت رہا تھا، شکار کرنے سے پہلے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے مسکرا کے اس کی ہمت بڑھائی۔ میں بے عزتی کرانے پر تیار تھا، اسے عداوت کی دعوت دی۔ وہ گندی پلیٹوں میں اپنے شکوے رگڑنے لگا۔ جب وہ دوبارہ میری جانب پلٹا تو اس کے ہونٹوں پر ڈرامائی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جیسے وہ جو دل دکھانے والی بات کہنے جا رہا تھا اس پر معذرت طلب کر رہا ہو۔ 'وہ کہہ رہا تھا کہ وہ چالاک ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت تمھیں لوٹتے ہیں لیکن آپ اسے چوری بھی نہیں کہہ سکتے' وہ پھر مسکرایا۔ میں صبر سے منتظر رہا۔ میرے خیال میں مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہے گا۔

'وہاں کافی عرب رہتے ہیں' وہ پھر ہچکچایا۔ اس کے چہرے پر تنفر کے آثار نمودار ہو گئے 'وہ بتا رہا تھا کہ وہاں مرد، مردوں سے جفتی کھیلتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں؟ وہ کتوں کی طرح پشت سے ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔'

وہ اب میز کی دوسری جانب میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ میری طرف سے رخ پھیر کے وہ آہستگی سے اپنا سر ہلانے لگا 'کتنا قبیح فعل ہے، جانوروں کی مانند!' اس کی بھنویں ایسے سکڑ گئی تھیں جیسے بہت حیرت اور کراہیت کا شکار ہو۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرت جھلک رہی تھی۔ وہ مجھے جواب طلب نظروں سے دیکھنے لگا۔ جب میں کچھ نہ بولا تو وہ آہستگی سے سر ہلانے لگا،

اس کا منہ نیم وا تھا 'مرد ایسے نہیں ہوتے' وہ بولا۔ 'وہاں ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں، انھیں جیل میں ڈال دیتے ہیں؟'

ایک افسوس ناک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید علی کو یہ سب کہنے کی ہدایت ملی ہے۔ مجھے اپنے والد اور ان کی بدنامی یاد آئی۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں یہ سب چھوڑ کر واپس ان کے پاس جاؤں اور انھیں بتاؤں کہ ہم اس سے زیادہ کے مستحق ہیں بھی نہیں۔ پوری دنیا ہمیں حقارت سے دیکھتی ہے۔ علی مسکراتا ہوا باقی برتن دھونے کے لیے سنک کی جانب مڑ گیا۔ میں نے اپنے لیے ایک اور کافی کا کپ بنایا، اس مرتبہ بغیر دودھ کے۔ 'میں نے سنا ہے' اس کی آواز نیچی تھی' کہ سفید فام عورتیں کتوں کے ساتھ ایسا فعل کرتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ کتوں سے اپنے جسم کو چٹواتی ہیں۔ ایک دوست نے بتایا تھا جو یورپیوں کے ساتھ کام کرتا تھا، آپ کا کیا خیال ہے یہ سچ ہے؟ وہ بتا رہا تھا کہ اس عورت کے سارے جسم پر نشان پڑے ہوئے تھے۔' میں کندھے اچکا کے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ بھی اپنی خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کینہ پروری کا مختصر دورہ ختم ہو چکا تھا۔ وہ دوبارہ اپنی بے داغ غیر جانب داری کے پیچھے روپوش ہو چکا تھا۔ 'آج بارش ہوگی' وہ بولا۔

اس فقرے کی یاد دل کی پنہائیوں میں اتر گئی۔ آج رات بارش ہوگی انھوں نے اس رات کہا تھا جب ہم صحن میں بیٹھے یہ خواب بُن رہے تھے۔ میں باہر باغ میں نکل گیا۔ پہاڑیاں سامنے سے چلتی دور تک چلی گئی تھیں، فاصلے پر ڈوبتی ابھرتی نظر آتی تھیں۔ یہاں روشنی گھر کی مقابلے میں کم خیرہ کن تھی۔ میں بیڈمنٹن کورٹ کے حاشیوں کے ساتھ چلتا درختوں کی جانب بڑھ گیا۔ عقبی باڑ سے پرے اونچی سبز گھاس سے بھرے میدان تھے۔ دور پہاڑیاں دھندلا کے افق کا حصہ بن گئی تھیں۔ باڑ کے نزدیک میری موجودگی سے لاپروا دو ہد ہد بیٹھے تھے۔ میں وہاں کافی دیر ٹھہرا انھیں دیکھتا رہا۔ آخر ان کی نگاہیں مشکوک ہو گئیں۔ ان کی گردنیں اشتعال میں گھومنے لگیں۔ روشنی ان کے چمک دار بھورے پروں سے منعکس ہو کر ہرے و پیلے سلمٰی ستارے بکھیر رہی تھی۔

میں درختوں کی جانب واپس لوٹ گیا اور ایک باریش درخت کی چھاؤں میں لیٹ گیا۔

میں چونک کے اٹھا، اس بات پر حیران تھا کہ میں پھر سو گیا تھا۔ میرے سر پر آسمان بدل چکا تھا۔ سورج نے درختوں سے جھانکنا بند کر دیا تھا اور بادلوں کی ٹکڑیوں کی اٹ کھیلیاں بھی ختم ہو کر ایک گہری سیاہ چھاتی ہوئی گھٹا میں مدغم ہو گئی تھیں۔ ہوا میں کسی حمام کا سا گھمس تھا۔

بادل کسی حیاتی خلیے کی مانند حرکت میں تھے۔ فضا پہ ایک متوقع خاموشی کا راج تھا۔ کہیں دور سے ایک چہکار فضا میں بلند ہوئی، لگتا تھا وہاں پہاڑیوں سے ابھری تھی۔

میں نے بارش کا انتظار کیا۔ مجھ پر شکست خوردگی اور کسل مندی غالب تھی۔ بارش یک دم آئی، بہت تیز اور شور۔ میں نے کچھ دیر خود کو بھیگنے دیا۔ اس کی قوت سے ہمت لیتا رہا۔ پھر میں اٹھ کے مکان کی سمت دوڑا اور چبوترے کی سیڑھیاں ایک ساتھ دو دو کر کے پھلانگ گیا۔

جب وہ سہ پہر دیر سے واپس آئے تو میں اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے سلمٰی کو گھر کی جانب آتے باڑ کے کنارے رستے میں دیکھا۔ اس کے بال اپنی سخت چوٹی سے آزاد ہو کر سیدھے ستود گئے تھے۔ اس سے اس کا چہرہ دبلا اور سخت گیر محسوس ہو رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کن اکھیوں سے میری کھڑکی کی جانب نگاہ ڈالی اور شاید وہاں میری موجودگی محسوس بھی کی۔ بوانا احمد کچھ دیر بعد گاڑی اندر لے آئے۔ میں باہر بیٹھک میں نکل آیا تا کہ وہ مجھے تنہائی پسند اور غیر مہذب نہ سمجھیں بوانا احمد کا مزاج برہم تھا۔ میں نے باورچی خانے سے ان کی آواز آتے سنی۔ سلمٰی باہر چبوترے پر کسی مشروب کی چسکیاں لیتی بارش میں نہائے میدانوں کا نظارہ کر رہی تھی۔

'خوب آرام کیا؟' وہ بہت تھکی ہوئی اور خستہ حال لگ رہی تھی۔

'بہترین' میں چبوترے پر اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولا۔ 'صبح میں وہاں باہر نکل گیا تھا، اور ایک باریش درخت کے نیچے آنکھ لگ گئی۔ دیکھو میرا کافی کا کپ ابھی تک وہیں ہے۔'

اس نے میری جانب مسکرا کے اپنا سر ہلایا 'تمھیں یقیناً کوئی بیماری ہے' وہ بولی

'یہ یہاں کی آب و ہوا کا اثر ہے۔'

'مجھے جا کر نہانا ہے' وہ بولی۔ اس نے اپنا گلاس وہیں چبوترے پر چھوڑ دیا، اور چل دی۔ بوانا احمد وہاں سے گزرے تو بولے 'حسن، تم اٹھ گئے آخر؟'

'بھئی میں چھٹیوں پر ہوں، ہوں ناں؟' میں بھی جواب میں پکارا

بوانا احمد نے اعلان کیا کہ وہ رات میں بہت ہلکا کھانا کھائیں گے۔ اس پر علی کو باورچی خانے واپس جا کر کھانے کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اس نے ہمیں سرِ شام ہی میز پر بلا لیا۔ کھانے کے کمرے کی کھڑکیوں سے دن کی روشنی ابھی تک جھانک رہی تھی

'کہاں ہے وہ؟ وہ ہمیں عجلت میں بلا کر پھر انتظار کراتا ہے۔ عجیب احمق ہے یہ علی!' بوانا احمد کرسی پر پیچھے ہو کر علی کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

سلمٰی نے کہنیاں میز پر رکھ کے چہرہ ہتھیلی پر سہار لیا۔ کھڑکی سے سورج کی روشنی اس کے بالائی ہونٹ پر اگی روئیدگی کو نرم کر رہی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ بوانا احمد کی نظریں مجھ پر مرکوز ہیں۔

'لگتا ہے کہ بارش رک گئی ہے' میں نے اس سے کہا

اس نے سر ہلایا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔ بوانا احمد کی انگلیاں بے قراری سے میز پر طبلہ بجا رہی تھیں۔ انھوں نے ایک غصیلی آواز نکالی وہ کھڑے ہونے ہی والے تھے۔ میں نے سلمٰی کی جانب دیکھا، وہ سیدھی بیٹھ گئی تھی، مداخلت کے لیے تیار۔ ان کے منہ سے دوسرے دھماکہ خیز کٹکٹانے پر وہ اٹھ کے میز کی دوسری جانب آ گئی۔ علی دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے ایک گہری قاب سینے کے قریب پکڑ رکھی تھی۔

'کیا کر رہے تھے تم؟' اس کے غصیلے مالک نے دریافت کیا۔ انھوں نے اپنی گھڑی کی جانب دیکھ کر مدد طلب نظروں سے میز کے اطراف نگاہ دوڑائی۔ جب تک علی نے ہمارے سامنے پیالوں میں سوپ انڈیلا ہ خاموشی سے بیٹھے رہے۔ میں بھی خوف زدہ، خاموشی سے سوپ پیتا رہا۔ سوپ کے چھوٹے گھونٹ لے کر نگلنے کی آواز کو دانستہ قابو رکھتا۔ بوانا احمد اپنے سوپ کا آخری چمچہ پیتے ہی رسماً 'معاف کرنا' کہہ کے اٹھ گئے۔

'کیا دن تھا یہ بھئی' سلمٰی نے گہرا سانس لیا

'تمھارا دن کیسا تھا؟ میں نے سنا ہے کہ تم کام پر گئی تھیں؟' میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے غیر محسوس طور پر کھنچاؤ ختم ہو گیا۔ لیکن وہ پھر بھی

خستہ حال لگ رہی تھی' تم کیا کرتی ہو؟'

'میں تو بس ایک کتابوں کی دکان میں جز وقتی ملازمت کرتی ہوں' وہ اپنے ہاتھ میز کے نیچے چھپاتے ہوئے بولی۔ 'میں یونی ورسٹی شروع کرنے سے پہلے ایک سال کا وقفہ لینا چاہتی تھی۔ ڈیڈی کا خیال ہے کہ میں بے وقوف ہوں۔ لیکن میں سیدھی اسکول سے یونی ورسٹی نہیں جانا چاہتی تھی، ایک مشینی سائکل ہو جاتا۔ میں کچھ مختلف کرنا چاہتی تھی۔'

'جیسے ایک کتاب گھر میں کام کرنا؟'

'ہاں مجھے ادراک ہے کہ یہ بہت سادہ سا کام ہے، ہے ناں؟ اگر میں بھی مرد ہوتی تو کسی مضافاتی کھیت میں ملازمت تلاش کرتی، یا کسی ملاح کے طور پر بھرتی ہو جاتی' وہ مسکرا کے بولی

'یا بڑے جانوروں کی شکاری ہو جاتی' میں نے لقمہ دیا۔

'کیا مزاح ہے بھئی' وہ بولی۔ 'تمھیں نہیں معلوم کہ کسی بھی کام کے لیے ڈیڈی کو راضی کرنا کتنا دشوار تھا۔ وہ کہنے لگے کہ لوگ باتیں بنائیں گے۔ آخر مجھے خاموش کرنے کے لیے انھوں نے ہی اس کتاب گھر میں مجھے نوکری دلوائی تھی۔ یہ بہت مہم جوئی تو نہیں لیکن کچھ نہ ہونے سے تو بہتر ہے۔ چھوڑو، میں سوچ رہی ہوں کہ علی نے سوپ کے علاوہ ہمارے لیے کیا تیار کیا ہے؟'

'امید ہے کہ ایک اور بریانی نہیں پکائی ہو گی'

میرے یہ کہنے پر اس نے منہ بنایا۔ تب مجھے خیال آیا کہ میرا یہ جملہ ایک قسم کا معذرت خواہانہ تھا، اور اس نے منہ بنا کے گویا اس موضوع کو غیر اہم قرار دے دیا تھا۔

'کیا تم اگلے برس نیروبی یونی ورسٹی جاؤ گی؟'

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

'میں وہاں کے ایک طالب علم سے ملا تھا' میں نے کہا 'ہم ریل میں ساتھ تھے۔'

'وہ یقیناً پوسٹ گریجوٹ طالب علم رہا ہو گا' وہ کچھ دیر سوچ کے بولی 'ورنہ پچھلے ہفتے تو طلبہ تعطیلات پر تھے۔'

مجھے موئی موونی کا ایک نیا رخ نظر آ رہا تھا۔ اگر وہ پوسٹ گریجوٹ کا طالب علم ہوتا تو

مجھے جتانا کبھی نہ بھولتا۔ اب میں اور بھی زیادہ اس سے دوبارہ ملنا چاہ رہا تھا

'کیا تم نے اس سال اسکول ختم کیا ہے؟' اس نے پوچھا

'ہاں' میں بولا 'اسی وقت کہ جب تم نے ختم کیا ہے'

'تمھارا نتیجہ ٹھیک تھا؟'

میں نے اسے سمجھایا کہ حکومت نے نتیجہ جاری ہی نہیں کیا۔ میں ایک دفعہ بولنا شروع ہوا تو پھر رکنا مشکل ہوگیا۔ وہ بغیر ایک لفظ بھی کہے مجھے سنتی رہی۔ جب میں نے کہا کہ مجھے یقین ہے میرا نتیجہ بہت اچھا رہا ہوگا تو وہ مسکرا دی، لیکن مذاق اڑانے والے انداز میں نہیں۔ علی پھلیوں کی ایک ڈش اور پراٹھوں سے بھری پلیٹ کے ساتھ داخل ہوا۔

اس نے سلمٰی کی طرف دیکھ کر مضحکہ خیز منہ بنایا تو وہ ہنس پڑی، ماحول کا تناؤ ختم ہو چکا تھا۔ اس کے سر کے ایک اشارے نے علی کو بوانا احمد کے بارے میں کچھ کہنے سے باز رکھا۔

'تو اب کیا چیزیں بہت دشوار ہوگئی ہیں؟' اس نے علی کے جانے کے بعد پوچھا۔

'ہاں،' میں اس موضوع پر گفتگو سے کترا رہا تھا

'نسلی امتیاز؟' اس نے پوچھا۔ یہ لفظ بظاہر بہت بے ضرر معلوم ہوتا تھا۔ ایک ایسے شخص کے منہ سے جسے اس گندگی کا کوئی تجربہ نہیں تھا، یہ لفظ بہت بے ضرر معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس کے لہجے میں شک کا شائبہ محسوس ہوا، جیسے میرے جواب کو مستند ماننے میں اسے تامل ہو۔'

'کچھ اسی طرح کی بات ہے' میں نے کہا

'مثلاً کیا؟' اس کے ماتھے پر شکنیں آگئیں

'مثلاً۔۔۔ ہاں نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس لیے نشانہ بنایا جاتا ہے کہ ان کی جلد سیاہ نہیں ہے۔ یہ انتقام ہے، وہ اپنا قرض واپس لوٹا رہے ہیں۔ لوگ خوف زدہ ہیں، حادثے ہوتے ہیں، ظلم کیا جاتا ہے، آخر میں نقصان سب ہی کا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں تو یہ سب ہی کے لیے خراب ہے، ہم سب ہی کچھ انسانیت کھو بیٹھتے ہیں۔'

مجھے لگا کہ وہ متفق نہیں ہے۔ میں پھلیوں اور پراٹھوں کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ہم کچھ دیر خاموشی سے کھاتے رہے۔ پھر وہ نائیجیریا کی جنگ کے بارے میں بات کرنے لگی۔ 'ایسا

متوازن ملک۔۔۔افریقہ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ ہم بھی لاطینی امریکا کی مانند ہو جائیں گے۔'
بیٹھک سے بوانا احمد کی کھانسنے کی آواز آئی۔ سلمیٰ ایک دم سے خاموش ہو گئی۔ میری طرح وہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ وہ اس سارے وقت وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ آواز نکالے بغیر ہونٹ ہلا کے بولی: ہمیں اندر چلنا چاہیے۔

'میں ذرا دیر چہل قدمی کے لیے جاؤں گا'۔ جب ہم کھانا ختم کر چکے تو میں بولا۔

میں پاس سے گزرا تو بوانا احمد نے اپنے کاغذات پر سے سر ہٹایا لیکن کچھ بولے نہیں۔ میں جھجکا، میں چاہتا تھا رک کر اپنا نکتۂ نظر واضح کروں۔ میرا خیال تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ میں ان لوگوں کو کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دوں، انھیں یقیناً ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا تھا۔

باہر بہت نمی تھی۔ میں رات کی تاریکی میں چہل قدمی کرنے لگا۔ شب کی آوازوں سے میں حیران رہ گیا۔ میں ایک قصبے میں پلا بڑھا تھا، جہاں دائیں بائیں گلیاں تھیں۔ جہاں جھینگر اور ٹڈے کمروں کے کونے کھدروں میں گھات لگا کر بیٹھتے اور سریلا الاپ لگاتے لیکن یہاں نیروبی کے دیہات میں تو وہ پورا گیت سنا رہے تھے، اور بلا جھجک شب کی خاموشی میں سوراخ کر رہے تھے۔ میں بہت دیر چلتا رہا۔ راستے کا کچھ حصہ تو ان بڑے مکانوں کے باغیچوں کی روشنی سے منور تھا جن کے پاس سے میں گزرا۔ مجھے کتوں نے واپسی پر مجبور کیا۔ یہ آوارہ کتوں کا ایک ٹولا تھا جس نے مجھے اپنا سب کام چھوڑ کر ایک سرسری دل چسپی سے ذرا زیادہ ہی توجہ دی۔ جب میں واپس پہنچا تو چبوترے کا دروازہ میرے لیے غیر مقفل چھوڑ دیا گیا تھا۔ نہ سلمیٰ نہ ہی اس کا باپ کہیں سامنے تھے۔ لیکن فضا میں ایک تناؤ تھا، فضا برہم سی تھی میرے خیال میں وہ میری غیر موجودگی میں لڑے تھے۔ میری خواہش تھی کہ وہ جھگڑا میرے بارے میں رہا ہو۔

کسی عورت کی چیخ سنائی دی تو میں یہ تحقیق کرنے کہ کیا ہو رہا ہے باورچی خانے میں نکل آیا مجھے شبہ تھا کہ علی اپنی مردانگی دکھا رہا ہوگا۔ میں تاریکی میں کھڑا شیشے کے دروازے سے باہر دیکھتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کیا میں علی کی ضربت اور اس کے ہیولے اپنی بیوی کے چہرے پر جھکتے ہوئے پہچان سکوں گا۔۔

بستر میں محض سلمیٰ کا خیال آتا رہا۔ آنے والے سالوں میں، میرے ساتھ جو بھی ہوتا

لیکن یہ مجھے معلوم تھا کہ میں اسے بھلا نہیں سکوں گا۔ میں لیٹا ہوا یہ تصور کرتا رہا کہ اس جیسی لڑکی کا محبوب ہونا کیسا محسوس ہوتا ہوگا۔ میں نے تصور کیا کہ صبح وہ مجھے اپنے ساتھ رووینزوری (Ruwenzori) بھاگ نکلنے کو کہے گی۔۔۔ بحر الغزل تک۔۔ یا دور سارا راستہ اسکندریہ تک۔ میں اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا، اور اس موضوع پر خاموشی کی وجہ دریافت کرنا چاہتا تھا۔۔

میرا ارادہ تھا کہ صبح جلدی اٹھوں گا تا کہ اپنی چوکسی ظاہر کر سکوں۔ لیکن پتا چلا کہ بوانا احمہ پہلے ہی جا چکے تھے۔ میں نے سوچا تھا ان سے کہوں گا کہ مجھے شہر چھوڑ دیں اور یونی ورسٹی کا راستہ بتا دیں۔ سلمٰی سے موسیٰ کے بارے میں گفتگو نے مجھے یاد دلا دیا تھا کہ میں اس کی ہم سفری سے کتنا محظوظ ہوا تھا۔ وہ کتنا زندہ دل اور سادہ سا نظر آتا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ کیا اس نے مجھ سے یونی ورسٹی کا طالب علم ہونے کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ ویسے جھوٹ سے مجھے حیرت نہیں ہوتی بلکہ یہ اس کی شخصیت کا ایک جز محسوس ہوتا۔ موقع کی مناسبت کو دیکھتے ہوئے یہ گھڑا گھڑایا جھوٹ اس کی زبان سے پھسل گیا ہوگا۔ اس کے پاس جانے کا ایک مقصد اپنی خود مختاری کا اعلان بھی تھا کہ اس خیراتی مشن کے علاوہ بھی میری کوئی زندگی ہے۔

میں نے علی کو باورچی خانے کی میز کے پاس گہری نیند میں بیٹھا پایا۔ میں نے چاہا کہ دبے پاؤں واپس نکل جاؤں، لیکن اس کی آنکھ کھل گئی، اور اس نے منہ سے بہتی رال کی لمبی لکیر واپس سڑک لی۔ اپنے سر سے نیند کا خمار اتارنے، یا ہتھیلیوں سے آنکھیں ملنے، یا کاہلی سے بدن کھجانے سے بھی پہلے مسکراہٹ اس کے چہرے پر سج گئی۔ وہ مسکراتا ہوا کوئی بھی لفظ کہے بغیر اٹھا اور میرے لیے انڈا بنانے لگا۔

'میں نے سنا ہے کہ ساحل پر بہت بڑی بڑی دکانیں ہوتی ہیں' وہ جماہی روکتے ہوئے

بولا

میں فوراً اٹھ کر بیٹھک کی جانب بھاگ نکلا، مجھے پشت سے علی کی حیرت زدہ سسکاری سنائی دی۔ اب پھر بارش ہو رہی تھی۔ میں شیشے کے کھلے دروازے کے سامنے کھڑا ہو کر، پانی کی پتلی لکیریں فضا کو ترچھی کاٹتی دیکھنے لگا، مجھے لگا کہ جیسے میں کسی زندان میں ہوں۔

'کتنا خوب صورت منظر ہے' سلمیٰ بولی۔ اس نے اپنی گردن کے اطراف ایک پیلی، بھوری اور سرخ دھاریوں والا اسکارف پہن رکھا تھا، جس میں ایک طرف سے یوں گرہ لگی تھی، کہ دونوں سرے اس کے شانوں سے کسی کاہل کانوں کی مانند لٹک رہے تھے۔ اس نے بال کس کر چہرے سے ہٹا رکھے تھے، لگا جیسے میں اسے پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ وہ کھلے دروازے پر میرے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ دروازے کی چوکھٹ کے سہارے جیسے کسی پرانی فلم کی بد کردار لڑکی۔ 'ان میدانوں کو دیکھو، خوب صورت ہیں ناں، کس قدر رومان پرور ہیں۔۔' اس نے گردن گھما کے چنگیز خان کی طرف دیکھا جو زخم خوردہ سا ڈیوڑھی میں کھڑا تھا۔ 'علی، کیا ان پہاڑیوں پر آبادی ہے؟ کیا ان پر لوگ رہتے ہیں؟ تمھیں نہیں معلوم؟ ڈیڈی کہتے ہیں وہاں کوئی نہیں رہتا، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ غلط ہیں۔'

'مس، مجھے نہیں معلوم' وہ شاکی، اپنی آزردگی دکھانا چاہتا تھا 'حسن صاحب آپ کا ناشتا تیار ہے۔'

سلمیٰ نے ایک نظر میری جانب دیکھا۔ وہ علی کے لہجے میں شکایت کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔ اس کی اس نگاہ نے میرے شبہے کو یقینی کر دیا کہ یہ مثبت رویہ کسی کھیل کا حصہ تھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

'کیا تم وہاں کبھی گئے ہو، علی؟' اس نے اپنی نو دریافت، پھولی سانس کے ساتھ کہا۔ وہ کسی زبردست دریافت کے سحر میں لگتی تھی۔ اس نے اپنی سانس پر قابو پانے کے لیے توقف کیا اور پہاڑ کی ہوا میں ایک گہرا سانس کھینچا۔ علی نے میری جانب دیکھا۔ وہ مسکرانے پر مائل تھا، لیکن اس نے اپنی ترغیب کی مزاحمت کی۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر آنکھیں نیچی کر لیں۔ 'شاید تمھاری موجودگی کے دوران ہمیں وہاں جانا چاہیے' وہ میری جانب مڑتے ہوئے بولی۔ 'تم جانا چاہو گے، ہم پکنک منا سکتے ہیں۔'

زمین کے آخری خطے تک! چنگھاڑتے ہوئے طوفانوں کے اندر۔۔ تمام رستے اسکندریہ تک۔ ہماری راہ میں کوئی آگ، کوئی صحرا مزاحم نہیں ہو سکتا۔۔۔ کہیں بھی۔ سوائے ان اصطبلوں کے جہاں مشکوک کسان ان بنجر ڈھلوانوں سے زندگی کھرچنے میں مصروف ہیں۔ خالی

میدانوں اور آسمان سے برستی بارش کی وجہ سے جہاں ہم کھڑے تھے وہاں کی خوب صورتی ہی کافی تھی۔

'میرا نہیں خیال کہ میں وہاں جانا پسند کروں گا' میں نے کہا

وہ ہنس پڑی 'نہیں، میں بھی نہیں۔ ہمیں صرف یہی پتا چل جائے گا کہ وہاں آبادی ہے' وہ میرے آگے، آگے کھانے کے کمرے کی طرف چلتے ہوئے بولی۔ 'وہ ہمیں گھوریں گے۔ ہمارے سوالوں کے جواب غصہ ور ناراضی سے دیں گے۔ یقیناً ہمیں کچھ فروخت کرنے کی بھی کوشش کریں گے کہ جس کی ہمیں چنداں ضرورت نہیں ہوگی۔ خیر، میں بھی سنجیدگی سے تو نہیں کہہ رہی تھی۔ سنو، میں تھوڑی دیر میں ایک دوست سے ملنے یونی ورسٹی جاؤں گی۔ میں نے سوچا تم بھی شاید اپنے دوست کی تلاش میں چلنا چاہو' لیکن مجھے اس کی آواز میں خوف کا احساس ہوا کہ کہیں میں اس کی دعوت ٹھکرا نہ دوں، یا اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لوں۔ میں تو شکر گزار تھا کہ وہ اتنی خوش اور بشاش نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے خیر مقدمی کا احساس دلا رہی تھی۔

'میں یقیناً جانا چاہوں گا' میں نے کہا 'میں ویسے بھی یہی کرنے کا سوچ رہا تھا۔۔۔'

ہم میز پر بیٹھ گئے اور علی نے تمیز لیکن خفگی سے انڈے کی پلیٹ میرے سامنے سرکا دی۔ وہ اس کے لیے ایک چکوترا اٹھا لایا، بیچ سے دو ٹکڑے کیا ہوا، اور اس کا گودا نکلا ہوا۔

'میں تیس برس کی عمر میں موٹی نہیں لگنا چاہتی۔ وہ اس حقیر پھل پر میری حیرت زدہ نگاہ کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ یہ خاندانی مسئلہ ہے۔ ڈیڈی کو دیکھو، ہم سب ہی ایسے ہیں۔' وہ غیر دماغی سے مسکرائی، جیسے اس کا ذہن کہیں اور ہو۔

'تمھاری پھوپھی، میری ماں، وہ تو موٹی نہیں' میں نے کہا

اس نے سر ہلا کے نظر دوسری جانب پھیر لی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کی ماں کے بارے میں متوقع اگلا سوال کروں۔

'ہمیں بارش کے رکنے کا انتظار کرنا پڑے گا، تب ہی جا سکیں گے' وہ بولی۔

آخر ہم بارش میں ہی نکل گئے۔ اس نے گھر کے نزدیک بس اسٹاپ کی جانب بس آتے دیکھی تو بھاگ پڑی۔ مجھے بھی چیخ کر، اور ہاتھ ہلا کر جلدی کرنے کا اشارہ کرتی گئی۔

میرے خیال میں وہ بوانا احمد کے لنچ پر گھر آنے سے پہلے نکل جانے کی کوشش میں تھی۔

'ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' جب ہم بس میں چڑھ گئے تو وہ بولی۔ 'مجھے چند چیزیں خریدنی ہیں، اپنی دوست مریم کے لیے ایک تحفہ لینا ہے۔ ۔ ۔ اور میرے خیال میں تمھیں جوتوں کی ایک نئی جوڑی درکار ہے۔ اس کے بعد ہم مریم کی طرف چلیں گے۔'

'مریم کو میرے جوتے نہیں پسند آئیں گے کیا؟' میں نے پوچھا

'مریم کو تو بہت پسند آئیں گے۔ وہ ایسے ہی رومان پرست ہے۔ بہت غیر عملی۔ اسے کوئی عام یا معمول کی بات پسند نہیں آتی۔ اس کا خاندان نیروبی میں ہی رہتا ہے، مگر پھر بھی اس نے یونی ورسٹی میں ہی کمرا لینے پر اصرار کیا۔ تم خود ہی دیکھ لینا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کوئی آزاد منش ہے۔ ۔ ۔ ہمیشہ وہ کرے گی جو کوئی اور نہیں کرنا چاہتا۔ وہ سب کو پاگل کر دیتی ہے۔'

'لگتا ہے بہت دل چسپ ہے' میں نے کہا

ہم کینیاٹا (Kenyatta) ایوینیو گئے۔ مجمع کو ہٹاتے، فٹ پاتھ پر ہاکروں سے بحث کرتے۔ فٹ پاتھ پر کیچڑ سے پھسلن ہو گئی تھی، اور لوگوں سے بھری ہوئی تھی، جو ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ ایک ٹھیلے والا میرے پیچھے ہی پڑ گیا اور مستقل ایک سونے کا پانی چڑھی سیسکو گھڑی میری کلائی پر باندھنے کی کوشش کرتا رہا۔ سلمٰی یہ کہہ کر اس کی ہمت بڑھاتی رہی کہ میں لامو (Lamu) کے امیر ترین آدمی کے بیٹوں میں سے ایک ہوں۔ آخر ہم نے ریور روڈ پر پناہ لی، اور ایک بزاز کی دکان میں جا گھسے۔ میں سب سے زیادہ اس کی رفاقت سے باخبر تھا۔ کبھی کبھار اس سے مس ہو جاتا۔ اگر وہ مجھ سے مشورہ مانگتی تو اس پر مسرور ہوتا۔ میں چیزوں کی ساخت کی مہارت، یا ان کے ڈیزائن کے عامیانہ پن کا ماہر بن جانے پر مسرور تھا۔ وہ مجھے اکساتی رہی، دکان داروں کو ہراساں کرتی رہی، انھیں قیمت کم کرنے پر مجبور کرتی رہی۔ جب پھر بھی میں آخر میں خریدنے پر آمادہ نہ ہوتا تو ان کی طرف ہم دردی طلب نظروں سے دیکھتی رہی۔ کبھی کبھار میں خود پر ٹھہری اس کی نگاہ سے واقف ہو جاتا، تو مجھے خیال آتا کہ میں اپنے کردار کی حدوں سے آگے تو نہیں جا رہا۔ اس نے مجھے کئی ایسے جوتے دیکھنے پر اصرار کیا جو مجھے معلوم تھا کہ میری قوتِ خرید سے باہر ہیں۔ میں نے ہانگ کانگ کے بنے ربر کے جوتوں کا ایک

جوڑا خرید لیا۔

ہم ایک بوتیک میں گئے۔ رنگین بلب اور پنیاں چھت سے لٹک رہی تھیں۔ یہاں ہر کپڑے پر غیر ملکی لیبل لگا ہوا تھا۔ قیمتیں بھی مضحکہ خیز حد تک غیر حقیقی تھیں۔ سلمیٰ نے مریم کے لیے ایک اسکارف خریدا۔ کم از کم کوالٹی تو مستند ہوتی ہے۔ وہ مجھے مارک اور اسپنسر کا لیبل دکھا کے بولی۔ دکان میں ہی ایک کیفے تھا ہم وہاں آئس کریم کھانے رک گئے۔ آئس بڑی کشتی نما قابوں میں آئی، جس پر پھلوں کا جوس اور خشک میوے کا چھڑکاؤ تھا۔ اس ملغوبے کے وسط میں ایک بسکٹ کا ٹکڑا پھنسا کے کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں تو وہ پاخانے کا ایک سوکھا ہوا ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میری ہنسی نہ نکلے۔ کیوں کہ سلمیٰ تو اپنی رنگین قاب کو بہت سنجیدہ دل چسپی سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے آئس کریم کا پہلا چمچہ منہ میں رکھا تو ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میرے قہقہوں کے درمیان آئس کریم اور خشک میوے کی بوچھاڑ کھانے کی میز پر ہر طرف بکھر گئی۔

میں نے ہر طرح کوشش کر لی۔ آنکھیں بند کر کے دیکھا۔ ایک نئی طلب کر لی۔ میں نے دیکھا کہ سلمیٰ اپنی آئس کریم بہت مزے لے کر کھا رہی ہے، لیکن میں اپنے آپ کو آئس کریم کھانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ ہم دکان سے نکلے تو سلمیٰ کی پھٹکار میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ یہ پورے نیروبی میں آئس کریم کی سب سے مہنگی دکان ہے، تم نے دیکھا نہیں تھا وہ سب سفید فام لوگ بھی وہیں کھا رہے تھے، اور تم نے اسے میز پر تھوک دیا۔ یہ آئس کریم ہوائی ستان کہلاتی تھی۔ جب بھی میں اپنے اوپر قابو پاتا تو سلمیٰ وہ نام لے لیتی اور میں پھر شروع ہو جاتا۔

'اب مریم کے یہاں جانے کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے' ہم واپس کینیاٹا ایوینیو کی طرف بڑھے تو وہ بولی۔ 'اگر تم نے ہوائی ستان میں اتنی دیر نہ لگائی ہوتی تو۔۔۔'

جب ہم سہ پہر دیر سے گھر پہنچے تو بوانا احمد پہلے ہی آ چکے تھے۔ گو انھوں نے مسکرا کے ہماری سیر کے بارے میں دریافت کیا، لیکن ظاہر تھا کہ یہ بات انھیں پسند نہیں آئی۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک کھنچاؤ، اور ان کے سوالات کا انداز استہزائی تھا۔ اس شام، بعد میں سلمیٰ کی مسکراہٹوں اور حوصلہ افزائی کے سہارے میں نے گھر کے بارے میں بات کی، ساحل اور اپنے

والدین کے بارے میں بتایا۔ وہ بہت کم بولے لیکن صاف ظاہر تھا کہ منہ بناتے رہے، اور اکثر سلمیٰ کو غصے سے دیکھتے۔ میرا نہیں خیال وہ واقف تھے کہ ان کا چہرہ ان کے جذبات کا کتنا صحیح آئینہ ہے۔

مجھے یقین ہے کہ گزشتہ رات کا جھگڑا میرے بارے میں تھا۔ اور سلمیٰ نے میری حمایت کی ہوگی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بوانا احمد کو کیا بات بری لگی ہوگی۔ میں ان ہی کی دعوت پر آیا تھا پھر مسئلہ کیا تھا۔ اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ان کی بدتمیزی پر ناراض ہو کر تو واپس نہیں جاؤں گا۔ وہ مجھے چاہے پیسے نہ بھی دیں لیکن میں اپنی تعطیلات گزار کر ہی جاؤں گا۔

گو اس وقت مجھے یہی خیالات آرہے تھے، لیکن مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ معاملہ صرف یہی نہیں ہے۔ میں تو اتفاقاً ہی وجہ نزاع بن گیا ہوں ورنہ اور بھی معاملات ہیں جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ آخر بوانا احمد نے ہی ایک آہ بھر کے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ سلمیٰ نے ان کی جانب دیکھا تو اس کی نگاہوں میں فکر کی پرچھائیاں صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ میں نے جتنی جلدی ممکن ہوا اپنی کہانی مکمل کی اور وہاں سے بھاگ نکلا۔

دوسری صبح سلمیٰ مجھے علی سے باتیں کرتی باورچی خانے میں ملی۔ وہ ایک دیرینہ مہارت سے لیکن بے توجہی سے آٹا گوندھ رہا تھا اور ذرا آگے جھک کے اس کی بات بھی سن رہا تھا۔

'میں آپ کا ناشتا لے آؤں گا' جیسے ہی اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ بول پڑا، گویا مجھے وہاں سے جانے کا عندیہ دے رہا ہو۔ سلمیٰ ہنس پڑی۔ میں نے سوچا کہ یہ تو گویا اس احمق پادو کو اس کی بچکانہ ناراضی پہ اکسا رہی ہے۔۔ وہ ایسے آدمی کے ساتھ کیسے ہنس سکتی ہے کہ جو سوتے میں بھی انڈا ابال سکتا ہے اور ہر رات اپنی بیوی کو مارتا ہے؟ میں اس دغابازی پر غور کرنے کے لیے بیٹھک میں چلا آیا۔ اس نے مجھے بہت جلدی میں ناشتا کرایا، سلمیٰ کو یہ عذر دیتا رہا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔

'یہ کچھ بنا رہا ہے' اس نے صفائی پیش کی۔

'کیا؟'

'ڈبل روٹی، سادی سی ڈبل روٹی۔'

'بوفلو، ہم ساحل پر اسے بوفلو کہتے ہیں۔'

بوفلو، یہ لفظ اچانک مجھے گھر کی یاد دلا گیا۔ مچھیرے اپنی کشتیوں کو صاف کرتے اور جال کو پانی میں پھینکتے تو پانی میں ایسے سوراخ بن جاتے گویا روشنی جھلملانے لگی ہو۔ سبز سمندر کی سر اٹھاتی موجیں۔ گھاس پھوس کے ساحل پہ آ کے ایسے بکھر جاتیں جیسے سورج سے جلے ہوئے خواب، جنھیں دھو کے چھوڑ دیا گیا ہو۔ گیلی مسام دار ریت میں پھنسے ہوئے۔ دور ایک چھوٹی سی کشتی بے مقصد، مضطربانہ سطح آب پر ڈوبتی، ابھرتی۔ سمندری نمک لگا لکڑی کا ایک کھوکھلا تنا گل سڑ رہا ہے۔ ساحل پر یوں پڑا ہے جیسے کسی ڈولفن کا پیٹ۔

میں وہ وقت یاد کرنے لگا جب اس سے پہلی بار ملا تھا، سینے پر تنگ ہوا بلاؤز، اس کے شانوں کی ہڈی پر کسا ہوا جلد سے باہر نکلنے کو بیتاب۔ اس کا ہر لمحے پر وقار توازن مجھے خوف زدہ کر گیا تھا۔ اب وہ ایک گہری سانس لے کر کرسی پر پیچھے ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کے دیکھا، ذرا جھجکی کہ جیسے ہمت جمع کر رہی ہو۔

'کیا تم کل رات ہم سے خفا ہو گئے تھے؟' اس نے پوچھا

'کیا وہ میری وجہ سے غصے میں تھے؟' میں نے جواب دیا

'نہیں، بالکل نہیں' وہ بولی۔ لگتا تھا جیسے اسے دکھ ہوا ہو۔ 'یہ سمجھانا مشکل ہے۔۔ لیکن۔۔ کبھی کبھار چیزیں جتنی دشوار ہوتی ہیں وہ انھیں اور زیادہ مبہم بنا دیتے ہیں۔'

'کیا میری یہاں موجودگی اس کا باعث ہے؟'

'نہیں، میرا نہیں خیال' وہ کچھ دیر بعد بولی

وہ چاہتی تھی میں سمجھ جاؤں کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ بتانا چاہ رہی تھی کہ میں ناکام ہو گیا ہوں، مجھے اس سے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ میں اس کی دوستی، اس کی قربت کھو دینے کے خوف سے زیادہ پریشان تھا۔ گو مجھے ادراک تھا کہ وہ مجھے ان کے برے رویّے کی وجہ سے ہی اتنی توجہ دے رہی ہے۔

'انھوں نے مجھے بلایا ہی کیوں تھا؟' میں نے دریافت کیا

وہ دوسری طرف دیکھنے لگی تو اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کسی کی وفاداری کا

امتحان نہیں لینا چاہیے۔ میں نے وہ سوال واپس نہیں لیا، ہم خاموشی سے بیٹھے اسے تحلیل ہوتا دیکھتے رہے۔ ایک مکھی کمرے میں گھس آئی تو وہ اٹھ کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ریڈیو سے ٹکرا کے زمین پر گری، اس کے پر تکلیف سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ بھاگ کر باورچی خانے میں گئی اور مسکرا کے ایک جھاڑو مجھے تھما دی۔ میں نے زور سے اسے مکھی پر مارا تو اس کا پیٹ پھٹ گیا، اور اس میں سے سفید پس نکلنے لگی، وہ دھیرے سے الٹ گئی۔ اس کے منہ سے اس کا نشتر ایسے اندر باہر آ جا رہا تھا جیسے کوئی شہوت کا مارا جانور۔ اس کے اکڑے ہوئے جسم پر اس کی بے نور آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

'میں تو صرف یہ چاہتی تھی کہ تم اسے باہر نکال دو' وہ بولی

اس نے بڑھ کے ریڈیو چلا دیا۔ ایک انگریزی آواز یوگنڈا کے اولین عیسائی مشنری کے بارے میں تبصرہ کر رہی تھی۔ نوآبادیاتی انتظامیہ نے مقامی، علاقائی اور لسانی تفرقات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

''چلو چلتے ہیں' وہ بولی 'دیکھتے ہیں کہ اگر آج ہم مریم سے مل سکیں۔'

میں اس جگہ کی بے رونقی پہ حیران رہ گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ طلبہ تعطیلات پر ہیں، لیکن مجھے مقبروں جیسی خاموشی کی بھی امید نہیں تھی، نہ ہی غیر آباد میدانوں کی اداسی کی۔ مریم یونی ورسٹی میں گریجوٹ اسسٹنٹ تھی۔ وہ تعطیلات کے دوران رک کر اپنے مقالے پر کام کر رہی تھی۔ سلمیٰ نے مجھے بتایا کہ وہ مصوری کی تاریخ کے حوالے سے متعلق کوئی موضوع ہے۔ ہم گندی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گئے۔ ایک لمبی راہداری میں سب دروازے ہرے رنگ کے تھے، اور بند تھے۔ گرد، حبس اور پرانے پسینے کی بو رچی ہوئی تھی۔ مریم ہمیں اپنے کمرے میں ملی۔ وہ ایک پستہ قد بھرے جسم کی لڑکی تھی، جو جلدی جلدی گفتگو کرتی اور جلد ہی مسکرا بھی دیتی۔ وہ سلمیٰ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ سلام، دعا اور خبروں کے تبادلے کے دوران وہ اس کا ہاتھ پکڑے رہی۔ اس کے کمرے میں کینوس اور اسکیچ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ دیواروں پر ٹنگے تھے، کچھ بک شیلف کے سہارے کھڑے تھے اور کچھ بے ترتیبی سے فرش پر پھینک دیے گئے تھے۔ یہ ویسا ہی کمرا تھا جیسا ایک طالب علم کا ہونا چاہیے تھا۔ میں ایک مانوس سے رشک کا شکار ہو گیا۔

جب سلمیٰ نے اس سے میرا تعارف کرایا تو اس نے اوپر سے نیچے تک میرا جائزہ لے کر اپنی رضا مندی دے دی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہنس رہے تھے۔

'تو تم ہو وہ ساحلی رشتہ دار، بہت ذہین مگر کنگال' وہ سلمیٰ کی طرف نگاہ کرکے بولی۔ 'میں نے تمھارے بارے میں سن رکھا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ تمھیں گھما پھرا رہی ہوگی۔' میں نے اسے ہوائی سنتان کی کہانی سنائی، جو اس نے خفگی سے مسترد کردی۔ 'تم بہت مادّہ پرست ہو سلمیٰ' اس نے بھنویں اچکا کے مجھے خود سیر کرانے کی دعوت دی۔ میں نے اس سے تصویروں کے بارے میں دریافت کیا کہ کیا یہ سب اس نے خود ہی بنائی ہیں۔ وہ تیار ہوگئی کہ مجھے اپنی چھوٹی سی گیلری کی سیر کرائے، اور بتانے لگی کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ وہ لکیروں، تنہائی اور اداسی کے بارے میں بات کرنے لگی۔ میں نے ایسے برتاؤ کیا جیسے کسی ناول کا کوئی مہذب اور متمدن کردار ہوں۔ میں نے مصوری کے کردار اور اس کے اثرات کے بارے میں سوال کیا۔ وہ اس رفتار سے بول رہی تھی کہ کبھی تو اس کی سانس پھول جاتی۔ میں اس کی ہر بات تو نہیں سمجھ سکا لیکن وہ شاید بہت پُرمغز گفتگو کر رہی تھی۔ میں ایسے سر ہلاتا رہا جیسے اس کے خیالات سے متفق ہوں۔ وہ مجھے ایک بڑی تصویر کے سامنے لے گئی تاکہ سمجھا سکے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ یہ ایک ٹوٹی کرسی کی تصویر تھی جو الٹی پڑی تھی۔ اس کے برابر میں ایک ہیٹ اور رستا ہوا فاؤنٹین قلم تھا۔ پس منظر میں بے ہنگم لمبی انگلیاں تھیں، جو دھندلے سایوں کے درمیان متحرک تھیں۔ اس کا نام بے وفائی تھا۔

'کیا یہ جدید آرٹ ہے؟' میں نے پوچھا

'میرا نہیں خیال کہ یہ آرٹ بھی ہے' وہ بولی۔ 'میں تو بس بنا دیتی ہوں، پھر یہ دیکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے آرٹ گردانتا ہے یا نہیں۔'

'یہ بالکل آرٹ ہے' سلمیٰ مجھے گھورتے ہوئے بولی 'اس کی کتنی قیمت لگائی تھی اس نے مریم؟'

'اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا' مریم ہنستے ہوئے بولی 'سلمیٰ تم واقعی بہت مادّہ پرست ہو۔ کتنے پیسوں میں یہ آرٹ نہیں رہے گا؟'

'پھر کیا پیمانہ ہوگا؟' سلمیٰ نے پوچھا

مریم نے تعجب خیز آواز نکالی اور میری جانب مدد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے شانے اچکا دیے۔ وہ مجھے ایک اور پینٹنگ کی جانب لے گئی جو اس نے بتایا کہ پکاسو کی ایک تصویر سے ماخوذ ہے، جسے وہ سب سے ماہر استاد مانتی ہے۔ میں کیوں متفق نہیں ہوتا؟ حال آں کہ فکری سطح پر اس نے ٹولکین (Tolkien) سے اکتساب کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے دونوں کا نام نہیں سنا تھا۔ وہ دونوں حیران رہ گئیں۔ کہنے لگیں وہ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ایسا ممکن ہے۔ میں نے مریم کی آنکھوں میں اپنا مرتبہ گھٹتے دیکھا، اس نے مجھ پر دوبارہ یوں نظر ڈالی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ انھوں نے میری لاعلمی کو ایک قریبی انڈین ریسٹورانٹ میں لنچ پر فراموش کردیا۔ میں نے ترّدد کیا، بحث کی، متاثر ہونے سے انکاری رہا۔ آخر میں سلمیٰ اتنے جوش میں آگئی کہ اس نے میری ران پر ہاتھ مارا 'تم ساحلی لوگ کیا جانتے ہو؟ تم تو محض کشتی بان اور مچھیرے ہو۔ 'وہ دونوں میری کم علمی پر برستی رہیں اور میں ران پر اس تھپڑ کا لطف لیتا رہا۔۔

وہ میرے ساتھ دفتر انتظامیہ تک آئیں تاکہ موسیٰ کے بارے میں دریافت کرسکیں۔ لیکن کوئی اس کے نام سے واقف نہیں تھا۔

جب سلمیٰ نے میری لاعلمی کی کہانی مزے لے کر سنائی تو بوانا احمد نے میری طرف داری کی 'اسے ان پاگلوں سے واقف ہونے کی کیا ضرورت ہے اانھوں نے ایسا کون سا اہم کام انجام دیا ہے؟' سلمیٰ نے ڈٹ کر دفاع کیا، لیکن بوانا احمد اپنا آخری سوال دہراتے رہے: انھوں نے ایسا کون سا اہم کام انجام دیا ہے؟ یہ بتاؤ مجھے تم نہیں بتا سکو گی۔ بتا سکتی ہو؟ انھوں نے ایسا کون سا اہم کام انجام دیا ہے؟ آخر اس نے ہار مان لی اور آسمان کی طرف نگاہیں کرکے صبر کی دعا مانگی۔ 'تم انھیں موقع مت دو کہ یہ تمھیں جاہل سمجھیں' وہ میری جانب مڑے 'ان کے لیے تو یہ سب فیشن ہے۔ پکاسو۔ کون ہے پکاسو؟ تم صرف مزے کرو اور انھیں اعصاب پر سوار مت ہونے دو کل یہ کسی اور کو جینیس کہیں گی۔'

'ڈیڈی، آپ جہالت کی بات کر رہے ہیں' سلمیٰ نے ترحم آمیز نظروں سے دیکھا۔ انھوں نے منہ بنا کر اس کی تنقید کو مسترد کردیا، اور میری جانب دیکھ کر سازشی انداز میں مسکرا دیے۔

'میں نے آج تمھارا انتظار کیا تھا' ان کے لہجے میں شکوہ تھا، لیکن وہ اپنے آپ سے خوش تھے 'میں سمجھا تم شاید جمعے کی نماز کے لیے مسجد جانا چاہو۔' اس شام وہ مجھے باہر لے گئے۔ کہنے لگے کہ یہ ان کا ہر جمعے کا معمول ہے۔

'میں تین سال سے جا رہا ہوں' وہ شہر کی جانب گاڑی چلاتے ہوئے بولے' ہم صابر عدنان کے گھر جمع ہو کر ایسے ہی گپ لگاتے ہیں۔ صابر بھی ساحلی علاقے سے آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم اس کے خاندان سے واقف ہو یا نہیں۔ اب وہ بہت امیر ہے۔ زیادہ تر پیسا اس نے اسمگلنگ اور غیر ملکی کرنسی کی لین دین سے بنایا ہے۔ لیکن وہ ایک اچھا آدمی ہے۔ ایک نرم مزاج شخص۔'

یہ ایک زبردست گھر تھا جو ایک پتلی سڑک پہ اچانک نمودار ہو گیا۔ چھوٹے مکانوں سے گھرا جو صبر سے اس کے اطراف جمع تھے۔ یہ مردانہ محفل تھی جس میں زیادہ تر سیاست اور پیسے پر گفتگو ہوتی رہی۔ صابر عدنان نے ہماری شاہوں کی طرح خاطر کی۔ جب بھی گفتگو ذرا دھیمی پڑتی تو وہ کوئی اختلافی چنگاری چھوڑ دیتا۔ بوانا احمد نے اسے میرے بارے میں بتایا۔

'تمھارا ہم وطن ہے۔ یہ ساحلی علاقے سے ہم سے ملنے آیا ہے۔'

'خوش آمدید' وہ مہربان شخص بولا۔ 'تمھارے گھر والے ٹھیک ہیں؟ تمھارے ماں، باپ، گھر میں سب لوگ؟ الحمد اللہ! اب تو وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ تمھیں چاہیے کہ اپنے ماموں سے کہو تمھیں نیروبی میں ہی نوکری دلوا دیں۔ یہاں اب بھی مواقع ہیں۔'

میں نے بوانا احمد کی طرف دیکھا کہ اس مشورے پر ان کا کیا ردِ عمل ہے۔ انھوں نے اپنے شانے اچکا دیے۔ 'اگر یہ چاہے تو نوکری تو موجود ہے۔ لیکن یہ نوجوان لوگ معمولی کام نہیں کرنا چاہتے۔ یہ تو دفتری کام بھی نہیں کرنا چاہتے۔ یہ تو بس پروفیسر، ڈاکٹر اور جینیس بننا چاہتے ہیں۔ آج میری بیٹی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ پکاسو ایک جینیس ہے۔ کون ہے پکاسو؟ میں نے اس سے پوچھا، کیا کیا ہے اس نے؟'

اس شام واپسی پر بوانا احمد بہت خوش گوار موڈ میں تھے۔ مجھے یہ وہم ہوا کہ وہ اس خیال کو پرورش دے رہے ہیں کہ مجھے ایک نوکری کی پیشکش کی جائے۔ انھوں نے مزید کچھ کہا تو

نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس بارے میں سوچ رہے تھے۔ جس طرح وہ اس موضوع سے بچ رہے تھے اس سے میرا شبہ اور پختہ ہو گیا۔ وہ شرمندگی چھپانے کے لیے ایسا ظاہر کر رہے تھے کہ جیسے ان کے پاس کوئی بہت زبردست راز ہے، جسے افشا کرنے کے بارے میں وہ سوچ بچار کر رہے تھے۔

جب ہم گھر پہنچے تو ہمیں ڈرائیو وے کے قریب ایک چھوٹا لڑکا کھڑا نظر آیا۔ بوانا احمد کار سے اتر کے اس سے گفتگو کرنے لگے۔ 'علی نے اپنے آپ کو زخمی کر لیا ہے' وہ کار میں واپس آ کر بولے۔ سلمٰی گھر سے نکل آئی اور وہ دونوں آپس میں کچھ سرگوشی کرنے لگے۔ پھر وہ باڑ کے موڑ پر تاریک حصے میں چلے گئے، ایک لمحے کے بعد وہاں سے کچھ آوازیں آنے لگیں۔ سلمٰی بہت جلدی واپس آ گئی 'ہماری مدد کرو' وہ بولی۔

علی دو کمروں والے اپنی جھونپڑی گھر کے برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مدھم سی روشنی میں، میں نے ایک گول چہرے والی پستہ قد عورت کو اس سے چند قدموں کے فاصلے پر کھڑے دیکھا، جو اس کے افتادہ جسم کو لاتعلقی سے دیکھ رہی تھی۔ ہم علی کو گھسیٹ کر روشنی میں لے آئے، وہ عورت ہمیں دیکھتی رہی۔ اس نے اپنے بازو پر گھاؤ لگا لیا تھا، جس میں سے اس کی ہڈی کی سفیدی نمایاں تھی، وہ شاید بے ہوش تھا۔

'یہ کس نے کیا؟' اتنا سارا خون دیکھ کر میرا جی متلا رہا تھا 'خود ہی کیا ہے' بوانا احمد کی آواز غیر معمولی طور پر دھیمی اور دکھ بھری تھی۔

'خود ہی کیا ہے؟ میں نے تو کبھی اتنا خون نہیں دیکھا۔'

'یہ بہت سگریٹ پیتا ہے' سلمٰی جلدی سے عورت پر نظر ڈالتے ہوئے بولی 'پھر اس قسم کی حرکت کر دیتا ہے۔ ڈیڈی ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔ مالی کی حالت دیکھو' اس نے دوبارہ عورت کی جانب دیکھا 'جب وہ اپنے آپ کو زخمی کرتا ہے تو یہ ایسے ہی زومبی بن جاتی ہے۔ یہ مالی اس کی بیوی ہے۔'

میں نے علی کو کار میں ڈالنے میں ان کی مدد کی۔ وہ عورت بھی ایک احترام بھرے فاصلے کے ساتھ پیچھے آئی۔ سلمٰی نے اسے پیچھے لٹایا، جب کہ مالی سڑک پر کھڑی انھیں کار میں جاتا

دیکھتی رہی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ تنہا رہ گیا ہوں۔ مجھے خیال ہوا کہ ہمدردی کے چند بول بولنے چاہییں۔ لیکن میں اس کے وجود کی گندگی سے اتنا حیران تھا کہ شرم اور خوف میں لپٹا ہوا، جلدی سے واپس اندر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنی ماں اور ذکیہ کی یاد دلا دی تھی۔

میں نے کچھ دیر انتظار کیا لیکن پھر نیند برداشت نہ ہوئی۔ جب وہ واپس آئے تو میں کرسی میں سو رہا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو بوانا احمد میرے اوپر جھکے نرمی سے مجھے جگا رہے تھے۔ 'تین بجے ہیں' وہ بولے 'جاؤ بستر میں جاؤ' سلمیٰ مسکرا رہی تھی، اس نے سینے پر ہاتھ باندھ رکھے تھے۔

'میں سو گیا تھا' میں نے کہا۔ بوانا احمد نے اٹھنے میں میری مدد کی 'کیا حال ہے اس کا؟' میں نے پوچھا

'کہنی کے قریب کا زخم خراب ہے' سلمیٰ بولی 'ویسے وہ ٹھیک ہے۔'

'بچ جائے گا، احمق، کمینہ' بوانا احمد بولے

'وہ کل اسے چھوڑ دیں گے' سلمیٰ بولی 'پھر مالی اس کی دیکھ بھال کرے گی، وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے، صمٌ بکمٌ ہو جاتی ہے۔ وہ بہت خراب حرکتیں کرتا ہے۔ پہلے اس کو مارتا ہے، اور پھر یہ۔۔۔ خود کو زخمی کرتا ہے۔'

'ایک دن خود کو ختم کر لے گا یا اس کو مار دے گا' بوانا احمد تلخی سے بولے 'چلو سو جاؤ، سب بستر میں چلو، میں جا کر مالی کو بتا دیتا ہوں۔'

دوسرے دن ہم نے بیڈمنٹن کھیلا۔ بوانا احمد ہم میں سب سے بہتر کھلاڑی تھے، اور وہی سب سے زیادہ لطف لے رہے تھے۔ جب انھوں نے باہر آ کر کھیلنے کی تجویز پیش کی تو وہ پہلے ہی کھیل کے لیے نیکر اور ٹی شرٹ بدل چکے تھے۔ وہ گھاس کے کورٹ میں اپنے پستہ قد وقار کے ساتھ ہر چیز کے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ بالکل تھکے نہیں لگ رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے خراب شاٹس کا مذاق اڑایا، یہاں تک کہ زچ ہو کر سلمیٰ دوڑ کے ان کے کورٹ میں گئی اور ریکٹ ان کو مارا۔ صرف میرے ساتھ اکیلے رہ جانے پر ان میں قتلِ عام کی تحریک ختم ہو چکی تھی۔ ہم چبوترے پر بیٹھ کر ٹھنڈے مشروب پیتے، اپنی اپنی خاموشی میں ان باتوں پر غور کرتے

رہے جو زیرِ موضوع نہیں آئی تھیں۔

'تم پیر کو کام پر جاؤ گی سلمیٰ؟' انھوں نے اعصاب شکن خاموشی کے بعد پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ 'میرا خیال ہے کہ پیر کو حسن میرے ساتھ جائے گا۔۔۔شوروم پر۔ وہاں جا کر دیکھے کہ ہم لوگ یہاں کیا کام کرتے ہیں۔ اگر وہ نوکری قبول کرنے پر آمادہ ہو، کہ جو میں نے اسے پیش کی ہے۔'

'کون سی نوکری؟' سلمیٰ بولی

انھوں نے تفصیل بتائی، وہ مسکرا کے ہمت افزائی کرتی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ایک دوسرے سے خوش ہو رہے تھے۔ انھوں نے عزت بچالی تھی۔ مجھے خالی ہاتھ واپس نہیں بھیجا جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انھیں مجھ سے انکار کی توقع ہے۔ مجھے یہ قبول کرنے میں یوں بے عزتی محسوس ہو رہی تھی کہ یہ تو گویا ان کی مہربانی سے فائدہ اٹھانے والی بات ہے۔

سلمیٰ نے وہ دوپہر باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کرنے میں گزاری۔ بوانا احمد استراحت کے لیے چلے گئے۔ میں بیٹھک میں جا کر کتابوں کے انبار سے کھیلنے لگا۔ کبھی سلمیٰ باورچی خانے سے آ کر کچھ دیر میرے ساتھ بیٹھ جاتی۔ اس نے پیشکش کی کہ وہ اپنا ریکارڈ پلیر اور ریکارڈز لا سکتی ہے۔ کہنے لگی 'مجھے تو رقص سے عشق ہے۔'

'تم کون سے رقص کر لیتے ہو؟' اس نے پوچھا

میں نے اسے بتایا کہ میں نے زندگی میں کبھی رقص نہیں کیا۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آیا، پھر وہ کہنے لگی کہ وہ مجھے خود سکھائے گی۔ اس نے مجھ پر دانش مندانہ نظر ڈال کر پہلے ارادہ کیا کہ کچھ کہے مگر پھر اس نے ارادہ بدل لیا۔ مجھے معلوم ہے وہ چاہتی تھی کہ میں نوکری کی پیشکش کے بارے میں کچھ کہوں، گویا مجھے یہاں مدعو کرنے کا ایک مقصد تو پورا ہو گیا۔

'کبھی تمھاری ماں کا ذکر کیوں نہیں آتا؟' جب وہ دوبارہ باورچی خانے سے آئی تو میں نے پوچھا۔ اس نے برآمدے کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کے بعد وہ واپس لوٹ کے نہیں آئی۔

اتوار کے دن ہم گاڑی میں مضافات کی سیر کو نکل گئے۔ وہ مجھے نیروبی چڑیا گھر لے

گئے۔ بوانا احمد ایسے جانوروں کا تعارف کراتے رہے جیسے وہ ان کی ملکیت ہوں۔ جب ہم گھر واپس پہنچے تو اسی دن علی ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر واپس آ چکا تھا۔ وہ معذرتوں اور کراہوں سے لبریز تھا۔ بوانا احمد نے اس کے ساتھ باورچی خانے میں ایک گھنٹا صرف کیا۔ پھر ہم باہر چلے گئے۔ ان کے ایک دوست نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا تھا۔ یہ ایک ایتھوپین تاجر کا خاندان نکلا۔ بوانا احمد نے میرا تعارف ایسے تاجر کے طور پر کرایا جو ان کے پاس کام کرنے آیا تھا۔

مالکن نے بڑی، چمک دار میز پر کھانے لگانے کے دوران نوکروں کی نگرانی کی۔ وہ منہ سے ایک لفظ نہ بولیں، بس چند قدموں کے فاصلے سے سینے پر ہاتھ باندھے نگرانی کرتی رہیں۔ ہم جتنی دیر وہاں رکے وہ خاموش ہی رہیں۔ صرف باپ ہی اپنی بیٹی اور دو بیٹوں کو گفتگو پر اکساتے رہے، کہ وہ اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا سکیں۔ بڑا بھائی سلمیٰ میں خاصی دل چسپی لیتا رہا، اس نے دوسرے دن کتابوں کی دکان پر ملنے کا عندیہ بھی دیا۔ جب ہم نکلنے لگے تو ماں نے صندل کی لکڑی کا ایک چھوٹا پیکٹ لا کر سلمیٰ کو دیا۔

بوانا احمد اس شام کی دعوت سے بہت مسرور تھے۔ وہ سلمیٰ کو چھیڑتے رہے کہ بڑے بیٹے کا رشتہ متوقع ہے۔ بہت امیر خاندان ہے، ان کا ہر قسم کا کاروبار ہے، اور وہ نوجوان بہت اچھا لگ رہا تھا۔ میں ان سے بڑی میں بہت کچھ وصول کروں گا۔ تمھارا کیا خیال ہے حسن، وہ جب اس کا رشتہ مانگنے آئیں تو میں کیا کہوں؟

'ان سے کہیے کہ سلمیٰ سے پوچھیں' میں نے ایک طویل سناٹے کے بعد اپنی آواز سنی۔ سلمیٰ نے طنز سے تالی بجا کے مجھے داد دی۔

بوانا احمد نہ صرف پرانی گاڑیوں کی تجارت کرتے تھے، بلکہ ان کی ایک فرج اور فریزر کی دکان تھی اور ایک گوشت کی دکان بھی۔ ہم نے وہ دن ایک کاروبار سے دوسرے کی جانب بے مقصد سفر کرتے ہوئے گزارا۔ کاروبار ان کے مینیجر چلا رہے تھے۔ لیکن وہ ان سے ایسا سرپرستانہ سلوک کر رہے تھے، جیسے ان کے ترش اور اچانک سوالات کے بغیر وہ کام کرنے کے اہل نہیں۔ سفر کے دوران فون کر کے انھوں نے کئی آرڈر منسوخ کیے، آڑھتیوں کو بہت تنگ کیا اور رقم کے موٹے بنڈل گنتے رہے۔

'میں ان میں سے کسی مینیجر پر بھروسا نہیں کر سکتا،' انھوں نے مجھے بتایا۔ ہم رقم لے کر جلدی سے بینک پہنچے تاکہ بند ہونے سے پہلے رقم جمع کرا سکیں۔ 'یہ ہر وقت مجھے دھوکا دیتے رہتے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں آ کر کام کرو۔ تم میرے لیے چیزوں کی نگرانی کر سکتے ہو، اور پھر جب تمھیں کافی تجربہ ہوجائے گا تو تمھیں مینیجر بنا دوں گا۔ ان افریقیوں پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ یا تو وُہ چوری کرتے رہیں گے یا پھر کاروبار بٹھا دیں گے۔ تم کسی بھی نام ور افریقی کے پاس صبح سویرے جاؤ تو اس کے پاس سے شراب کی بو آرہی ہوگی، ان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔'

جب ہم بینک پہنچے تو وہ ایک اندرونی دفتر میں ایک گھنٹے کے لیے غائب ہو گئے۔ میں کار میں انتظار کرتا رہا، شور مچاتی کاروں اور سائیکلوں کو پاس سے گزرتا دیکھتا رہا۔

'وہ مجھے غیر ملکی کرنسی نہیں دے سکے' انھوں نے واپس آکر کہا 'چلو کوک پیتے ہیں، پھر کہیں سے ڈالر خریدیں گے۔'

ہم نے کئی جگہ کوشش کی۔ ہر جگہ بوانا احمد کو بہت عزت ملتی، اور اندر کمرے میں لے جایا جاتا، میں باہر منتظر رہتا۔ آخر انھوں نے کہا کہ ہمیں بڑے ہوٹلوں میں جانا ہوگا، جہاں سیاح ٹھہرتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر پیسے تو بدلوا لیے تھے، لیکن اب بھی چند سو کم تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ غیر ملکی کرنسی کی کیا ضرورت ہے؟'

'تمھارا کیا خیال ہے وہ کاریں کہاں سے آتی ہیں؟ تمھارے خیال میں ہمیں کاریں فراہم کرنے والے یہ ردّی کرنسی قبول کرلیں گے، جو ہم یہاں استعمال کرتے ہیں؟'

ہم سیاحوں کے ایک بڑے ہوٹل کے پالم کے درختوں سے گھرے کار پارک میں پہنچے۔ ان میں سے ایک پام کے درخت کے نیچے بنچ پر موسیٰ بیٹھا ہوا تھا۔ میرے ماموں سیدھے اس کی جانب بڑھے، اور میں ان کے پیچھے گیا۔ موسیٰ نے فوراً مجھے پہچان لیا اور وہ ملنے کے لیے ایسے بڑھا جیسے کب کے بچھڑے ہوئے دوست ہوں۔

'کیسے ہو میرے دوست، کیسا لگا یہ بڑا شہر، یہ کیا تمھارے والد ہیں؟' اس نے ہنستے ہوئے میرا ہاتھ تھاما، اور پھر اسے پکڑے رہا۔ بوانا احمد اس درمیان انتظار کرتے رہے۔ جب

مجھ سے ملنے پر اس کی مسرت کچھ کم ہوئی، تب وہ ذرا سنجیدہ تاجرانہ انداز میں بوانا احمد کی جانب مڑا۔ انھوں نے پیسے اور مقدار کی بات کی۔ اپنی اپنی بات پر اڑے رہ کے دوسرے کو ہراس کیا، پھر رقم کی فراہمی اور وصولی کی تفصیلات طے کیں۔

'تم کسی اور دن دوبارہ آنا بھائی' جب ہم جانے لگے تو موسیٰ بولا 'میں تمھیں مرغی کھلاؤں گا اور پھر اس ٹور پر لے جاؤں گا جس کا میں نے وعدہ کیا تھا۔ میں ہمیشہ یہیں ہوتا ہوں۔ بس موسیٰ موو ینی کا نام لے لینا۔'

میں نے گاڑی میں سے دیکھا کہ کچھ دوسرے کرنسی کے دلال جو کچھ فاصلے سے ہمارے لین دین کو دیکھ رہے تھے وہ موسیٰ کے گرد جمع ہوگئے۔ انھوں نے قہقہے لگائے اور ہاتھ پہ ہاتھ مار کے موسیٰ کو مبارکباد دی۔

'تم اس بھیڑیے کو کیسے جانتے ہو؟' بوانا احمد نے واپسی میں پوچھا۔ جب میں نے انھیں بتایا تو انھیں بہت لطف آیا۔ 'وہ ایک کاسہ لیس ہے، بے حیثیت، وہ کسی اور کے پیسے سے تجارت کا خطرہ مول لینے کے بدلے چند شلنگ کماتا ہے۔ وہ غالباً کسی سفیر وغیرہ کے لیے کام کرتا ہوگا۔ وہ ایک دلال ہے جو سیاحوں کو عورتیں فراہم کرتا ہے، میں اسے جانتا ہوں۔'

ہم نے دوسرے دن جا کر ڈالر وصول کیے۔ موسیٰ خوشدلی سے باتیں کرتا رہا۔ ہم اس کے پیچھے ہوٹل کے اندر ایک نوادرات کی دکان میں گئے، جہاں پر رقموں کا اصل تبادلہ ہوا۔ لیکن نہ کوئی گھبرائی نظروں کا تبادلہ ہوا نہ ہی بھورے کاغذ میں لپٹے نوٹوں کے بنڈل حوالے کیے گئے۔ ہوٹل کے استقبالیہ کلرک کی نگاہوں کے سامنے اور داخلی دروازے کے پاس بیٹھے دو پولیس والوں کی موجودگی کے باوجود نوٹوں کا تبادلہ کھلے عام ہوا۔

'بھولنا نہیں' موسیٰ ہمیں کار تک چھوڑنے آیا 'جب بھی آؤ۔۔۔ میں یہیں ملوں گا۔ اس ٹور کے لیے آنا۔ ابھی مجھ سے وعدہ کر کے جاؤ دوست۔ خدا حافظ ڈیڈی، مجھے اپنی وصیت میں مت بھولیے گا۔'

'کوئی اس بدلحاظ کا منہ بند کرے گا؟ تمھیں معلوم ہے اس ٹور سے اس کی کیا مراد ہے، کیا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔؟

'ایک منٹ ٹھہریۓ' میں نے کہا اور کار سے چھلانگ لگا کر موسیٰ کے تعاقب میں گیا۔ اس نے قدموں کی چاپ سنی تو مڑ کر میرا انتظار کرنے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک بے رحم دلال کی ایک بے معنیٰ ہنسی تھی۔

'میں تمھیں ڈھونڈنے یونی ورسٹی گیا تھا' میں بولا۔

اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی لیکن اس کی آنکھیں شبہے سے سخت ہو گئیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیا میں نے غلط قدم اٹھایا ہے۔ کیا اب وہ میری لاعلمی کا مذاق اڑائے گا؟ یا وہ سمجھے گا کہ میں اس کے جھوٹ کا مذاق اڑانے اور اسے لیکچر دینے آیا ہوں۔

'میں جاتا ہوں وہاں کبھی کبھی' وہ بولا، اور ایک بڑے شہر کے منہ پھٹ دلال کی مانند ہنسنے لگا۔

'اور وہ قبائیوں کا قتل؟ یہاں سے کرنے کا ارادہ ہے تمھارا؟ میں بھی ہنس دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ سمجھ جائے کہ میں محض پارسا نہیں بن رہا، بلکہ واقعی جاننا چاہتا تھا۔

'سنو' وہ بولا۔ اس دفعہ اس کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو گئی 'میں یہی کام کرتا ہوں اور تم جیسے لوگ میرے گاہک ہیں۔ میرا جو دل چاہتا ہے میں کہتا ہوں۔ اور تمھارا جو دل چاہے تم یقین کرلو۔ مجھے نہیں پتا کہ تم کیا سمجھ رہے ہو۔ ۔ ۔ تم آکر مجھ سے ملنا چاہتے ہو؟ میں تمھیں یہیں ملوں گا، میں یہیں سے اپنا کاروبار کرتا ہوں۔'

'معاف کرنا' میں بولا 'مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ تم وہی شخص ہو جس سے میں پہلے ملا تھا۔'

'دفعان ہو' وہ بولا 'تمھیں کچھ نہیں معلوم ۔ ۔ ۔ جاؤ اپنے بڑے ڈیڈی کے پاس، وہ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'

میں واپس جا رہا تھا تو اس نے مجھے پیچھے سے آواز دی۔ اس نے مجھے خون آشام کہا، میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اسے وہ کرنے کا الزام دے رہا ہوں جو وہ ہم جیسے لوگوں کی ضرورت پوری کرنے کے لیے کرتا ہے۔ مجھے ایک گاہک کہنے سے اس کا یہی مطلب تھا۔ جب میں کار میں پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ لوٹنے سے پہلے مجھے اس کو بتا

دینا چاہیے تھا کہ میں اس کی بات سمجھ رہا ہوں، لیکن اس کی سوچ درست نہیں۔ اس نے چیخ کے کچھ اور بھی کہا مگر میں نے نہیں سنا۔ جب میں نے چلتی گاڑی سے اسے مڑ کے دیکھا تو وہ کولہوں پر ہاتھ رکھے، سر پیچھے کیے قہقہہ لگا رہا تھا۔ گو میں اسے سن تو نہ سکا لیکن اس قہقہے کا کھوکھلا پن تو میں پہچان گیا تھا۔

'تم واپس کیوں گئے تھے؟' بوانا احمد نے پوچھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ غصے میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے لہجے میں ہم دردی تھی اور یہ احتیاط بھی میرا مذاق نہ اڑائیں۔

'مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی آدمی ہے جو مجھے ملا تھا۔ میں اس مغالطے میں رہ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔'

'تم اسے پسند کرنے لگے تھے' وہ ایک طویل خاموشی کے بعد بولے 'کبھی ایسا ہو جاتا ہے اور پھر بعد میں یقین نہیں آتا کہ آدمی ایسی بے وقوفی کیسے کر سکتا ہے۔' وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ 'ایسا ہم سب کے ساتھ ہوتا ہے، اس کی فکر مت کرو۔ چل کر یہ بزنس مکمل کرتے ہیں، میں آج ہی یہ آرڈر دینا چاہتا ہوں۔'

باقی ہفتے میں بوانا احمد کے ساتھ نیروبی میں پھرتا رہا۔ وہ جہاں جاتے، لوگوں سے بحث کرتے۔ وعدہ کرتے کہ وہاں بزنس کرنے دوبارہ کبھی نہیں جائیں گے۔ وہ میرا تعارف ایسے کراتے جیسے وہ بھانجہ جو ان کے ساتھ کام کرنے آیا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میں ان کی ذات کا ایک حصہ ہوں، جیسے ان کی ملکیت ہوں۔ ان کے تینوں مینیجر مجھ سے ایسی اطاعت شعاری کا برتاؤ کرتے جو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میری موجودگی میں ہی بوانا احمد نے انھیں جتا دیا تھا کہ میں وہاں ان کی جگہ ملازمت کرنے آیا ہوں۔ وہ عادت ڈالتے کہ ملازمین ان پر انحصار کریں۔ اور جو لوگ ان کے لیے کام کرتے انھیں اکساتے کہ وہ ان کی سرپرستی کے شکر گزار ہوں کہ انھیں اس ملازمت کا موقع دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں ان کی ملازمت کے لیے وہاں نہیں رکوں گا۔ لیکن وہ وقتاً فوقتاً اپنی غیر متوقع مہربانیوں سے مجھے دانہ ڈالتے رہے، اور میری طرف گرم جوشی کے جذبات رکھتے رہے۔

اور پھر سلمیٰ بھی تو تھی۔ میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ اپنے والد سے سارے دن کی روئیداد سن

کے کتنی مسرور ہوا کرتی تھی۔ اور اس نے کتنی آسانی سے مجھے گویا خاندانی یگانگت میں داخل کر لیا تھا۔ لیکن میں اس یگانگت کا متمنی نہیں تھا، بلکہ میں نے خاندان کا ایک فرد بننے کی مزاحمت کی۔ میں شاید ہی کبھی اس کے ساتھ تنہا ہوتا، لیکن پھر بھی میں اس خطرناک اور پیچیدہ کھیل میں مشغول رہا کہ وہ اپنے لیے میری دل چسپی سے باخبر رہے۔ گو اب سوچتا ہوں کہ مجھ میں اتنی ہمت کہاں سے آ گئی تھی؟

ہفتے کے روز بوانا احمد اپنے ایک دوست کی تیمارداری کے لیے ہسپتال چلے گئے۔ جیسے ہی میں اور سلمٰی تنہا ہوئے، میں نے فضا میں ایک تناؤ محسوس کیا۔ وہ بہت سہولت سے گفتگو کرتی رہی لیکن ہماری آنکھیں ضرورت سے زیادہ متصادم ہوتی رہیں، میں اس کے رویّے کی یقین دہانی سے حرارت پاتا رہا۔ یہ سوچ کر کہ چیزوں کو ذرا آہستہ روی سے ان کے منطقی انجام تک پہنچنے دوں، میں ذرا پیچھے ہو گیا۔ وہ جا کر کمرے سے اپنا ریکارڈ پلیئر اٹھا لائی۔ ہم نے وہ دوپہر پرانے ریکارڈ سن کے گزاری، جب کہ سلمٰی مجھے ان کا پس منظر بتاتی رہی۔ اس نے مجھے والٹز کرنا سکھایا۔ جب تک میں قدم رکھنا سیکھ نہیں گیا وہ مجھے سنبھالے رہی۔ ہم محتاط تھے کہ ہمارے جسم ایک دوسرے سے مس نہ ہوں۔ لیکن میں اپنے بازو پر اس کے بازو کے لمس سے خوش تھا۔ اس کے ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ یا جب اس کا ہاتھ غلطی سے میرے کندھے سے ہٹ کر گردن کو چھو گیا۔ ڈانس کے سبق کے اختتام پر ہم نے جن مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا انھیں سازشی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے دوران سلمٰی میرے رقص کی مشق پر بے رحمی سے تبصرہ کرتی رہی۔

وہ علی تھا جس نے اندر داخل ہو کر ہمارے کھیل کو اختتام پذیر کیا۔ اس کے بازو پر پلاستر چڑھا ہوا تھا۔ گو اس کی بیوی نے آ کر باورچی خانے میں اس کا ہاتھ بٹایا لیکن پھر بھی گھر کا کام کاج وہ خود کرنے پر بضد رہا۔ وہ پردے برابر کرنے آیا تھا۔ جب اس پر میری نگاہ پڑی تو وہ محراب سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کے ہماری حماقت پر سر ہلایا، لیکن اس کی آنکھوں میں سختی اور شک کی جھلک تھی۔

'کیا کوئی پارٹی ہو رہی ہے؟' اس نے حیرت انگیز طور پر خود بھی رقص کے چند تیز اور باوقار قدم دکھائے 'بوانا جلد ہی گھر آ جائیں گے۔'

وہ کھڑکیوں کی جانب گیا اور پردے برابر کرتے ہوئے اس نے گردن گھما کے شانوں کے اوپر سے سلمٰی کی جانب دیکھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے دوسری طرف تھا۔ وہ ذرا پشیمان سی نظر آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی نگاہوں نے سلمٰی سے کیا کہا ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ میں نے اسے مغلوب تو نہیں کیا، لیکن پھر بھی گھر میں قبولیت پانے کے باوجود وہ مجھ سے غیر مخفی حقارت آمیز سلوک کرتا۔ اس کے لیے تو میں اب بھی غیر پسندیدہ مہمان تھا، اور سلمٰی کے ساتھ میرا رقص خود پسندی کی شہادت تھا۔

میں تمام وقت اس کے بارے میں سوچا کرتا، اور اس کے ساتھ رہنے کے بارے میں تفصیلی خواب دیکھا کرتا۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں علی کی نگاہوں نے اسے محتاط نہ کر دیا ہو۔ تو جب بھی وہ مجھ سے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے گفتگو کرتی تو میری امیدوں کے سوکھے دانوں پر دوبارہ پانی پڑ جاتا۔ کبھی یہ سب احمقانہ اور خطرناک لگتا، لیکن جو شروع ہو چکا تھا اسے روکنا بھی ممکن نہیں لگتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ایک فاتح ہیرو کے روپ میں تصور کیا جو مالک کی بیٹی سے زبردستی کر کے خود سے محبت پر مجبور کرے گا اور پھر اسے چھوڑ جائے گا۔ دوسرے خوابوں کے مقابلے میں یہ زیادہ محفوظ خواب تھا، لیکن سچائی سے بعید ترین۔ اگر میں اس کے ساتھ جنسی عمل کرتا تو یہ مہمان داری کے تمام آداب کے خلاف ہوتا۔ لیکن اگر میں اسے زیادہ عجلت میں چھوڑ دیتا تو مجھے خوف تھا کہ اسے ہمیشہ کے لیے کھو دوں گا۔ اور ہمیشہ یہی کسک رہے گی کہ نجانے وہ کیسی تھی۔ اس کے ساتھ جنسی عمل! مجھے تو ابتدا کی خبر بھی نہیں تھا۔ میرا نہیں خیال کہ میرے دل میں اس کی خواہش اتنی شدید اور مرتکز تھی۔ میں اس کی قربت کا خواہش مند تھا، اس کی مسکراہٹ کا، اپنے پہلو میں اس کی حدت محسوس کرنے کا۔ میں چاہتا تھا اسے اپنی ذہانت سے خوش کروں، اور جواباً وہ مجھ پر اپنی التفات کی نگاہ کرے۔

شام ڈھلے ہم باغ میں بیٹھ جاتے۔ ڈوبتا سورج اس کے گیسوؤں کو آتش زدہ کر دیتا، اس کی جلد حدت سے سرخ ہو جاتی۔ ہر روز مراحل زیادہ سنگین ہوتے گئے اور میں ہر گزرتے دن سے خوف زدہ رہنے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اپنے جذبات کی پامالی احمقانہ اور بزدلانہ ہے۔ مجھے مزاحمت کرنے کے بجائے اپنے آپ کو اس بہاؤ میں چھوڑ دینا چاہیے، پھر جو

ہو گا دیکھا جائے گا۔

علی اب ہم پر نظر رکھنے لگا تھا۔ کبھی میں نظر اٹھاتا تو بوانا احمد کی نگاہ خود پر مرکوز پاتا۔ ایک پُر فکر، پُر سوچ نگاہ۔ ایسے اوقات میں سوچتا کہ یہاں سے چلا جاؤں، ان شکوک سے بھاگ نکلوں، اور بعد میں مختلف حالات کے ساتھ لوٹوں۔ لیکن مجھے قسمت پر اتنا بھروسا نہیں تھا کہ چلا ہی جاتا، اور اتنا کچھ ان کہا ہی چھوڑ دیتا۔ گزرتے ایام کے ساتھ جذبات اور احساسِ جرم کی یہ کھچڑی مزید پک کر حواس پہ طاری رہنے لگی۔ بوانا احمد کے لیے مجھ سے گفتگو کرنا دوبارہ دشوار ہونے لگا تھا۔ اس احساس نے اتنی تقویت پہنچائی کہ مجھے ان سے ہم دردی محسوس ہونے لگی۔

ان کے گھر میرے قیام کے تیسرے ہفتے، ایک دن بدھ کے روز اس نے مجھ سے شہر چلنے کو کہا۔ وہ مریم سے ملی تھی اور مریم نے مجھے بھی ساتھ لانے کی ہدایت کی تھی۔ بوانا احمد نے ہمیشہ کی طرح ہاتھ کے اشارے سے اس بات کی اجازت دے دی کہ اس دن ان کے ساتھ نہ جاؤں۔ ان کی خواہش تھی کہ مجھے منع کرتے لیکن اب میں جان گیا تھا کہ وہ دونوں اس طرح نہیں رہتے تھے۔ میں انھیں بتانا چاہتا تھا کہ میں رکوں گا نہیں، کیوں کہ میرے خیال میں اب وہ نوکری کی پیشکش پر بھی پشیمان تھے۔ لیکن ابھی تک مجھے اس کا موقع نہیں ملا تھا، اور پھر میں جب تک خود کو تیار نہ کر لیتا، نیروبی کسی عجلت میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی ایسے بات کرتے کہ جیسے میں ٹھہر جاؤں گا لیکن خود اپنی فیاضی پر غیر مطمئن تھے۔

وہ مجھے کتابوں کی دکان پر لے گئی جہاں وہ ہفتے میں دو روز کام کرتی تھی۔ یہ ایک چرچ کے سائے میں ایک چھوٹی سی دکان تھی، جو مذہبی اور اسکول کی تدریسی کتابوں کے ترجموں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا نوجوان منیجر بہت مصروف تھا لیکن پھر بھی اس نے اتنا وقت ضرور نکالا کہ اپنا رویہ دوستانہ رکھے اور مجھے خیر مقدم کہے۔ اس کے بعد ہم سڑکوں پہ مٹرگشت کرتے رہے، دکانوں میں جھانکتے رہے۔

'میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم ان دکانوں میں کیوں داخل ہو رہے ہیں' میں نے احتجاج کیا 'تم کچھ خریدتی تو ہو نہیں۔ ہم اندر جا کر چیزوں کو دیکھتے ہیں، تم دکان دار سے بحث کرتی ہو

پھر ہم نکل جاتے ہیں۔ اس سب کا کیا مقصد ہے؟'

'مقصد یہ ہے کہ مجھے اس میں مزہ آتا ہے' وہ پسپا ہونے پر بالکل تیار نہیں تھی' میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ کیا مل رہا ہے؟' ایک پھل فروش اور اس کے ٹھیلے سے میری ناخوش گوار ٹکر ہوگئی۔ اس نے شدید زہریلے لہجے میں مجھے برا بھلا کہا، اور میرے آبا واجداد کی تاریخ بیان کی۔ میں غصے اور شرم سے کانپ رہا تھا۔ اس کے بعد میں بضد ہوگیا کہ سیدھے مریم کی طرف جاتے ہیں۔ وہ ہمیں یونی ورسٹی میں اپنے کمرے میں ملی۔ وہ تھکی اور آزردہ نظر آتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا کام اچھا نہیں ہورہا۔ 'میرے خیالات چاہے کتنے بھی باغیانہ ہوں، لیکن جب میں لکھنے بیٹھتی ہوں تو وہی روایتی، محفوظ، مستند فضولیات قلم سے نکلتی ہے۔ میں آرٹ اور افریقہ کے سماجی پس منظر کے باہمی ربط پر بات کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن بس وہی جھوٹی مذہبی بکواس نکلتی ہے ۔ میں اس لائق ہی نہیں ہوں۔'

ہم نے حوصلہ افزا کلمات کہے میری خواہش تھی کہ میں ان مشکلات کو سمجھ سکوں کہ جیسے وہ میری مشکلات تھیں۔ پھر ان ناکامیوں سے میں بھی بد دل ہو جاتا۔ میرے خیال میں وہ بہت جلد معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی اور اس نے مسکرا کے میری حوصلہ افزائی کی۔ سلمٰی نے اسے نوکری کی پیشکش کے بارے میں بتایا۔ 'کیا تم رکو گے؟' اس نے پوچھا

میں ایک طویل عرصے کے لیے خاموش رہا، سوچ رہا تھا کہ میں کتنی آزادی سے گفتگو کر سکتا ہوں۔ 'میرا نہیں خیال کہ رکوں گا' میں بولا

مریم نے مشفقانہ انداز میں سر ہلایا۔ سلمٰی کی جانب دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

'کیوں نہیں' سلمٰی نے پوچھا 'وہ بہت زیادہ مضطرب یا جھنجلائی نظر نہیں آئی۔ بلکہ مجھے ذرا سا دکھ ہوا کہ وہ مضطرب نہیں تھی۔ وہ محض جاننا چاہتی تھی۔

'کیوں کہ یہ پہلے واپس جا کر کچھ بننا چاہتا ہے' مریم بولی 'یہ کیوں چاہے گا کہ کسی قصاب کی دکان میں کام کرے یا تمھارے والد کے کبھی نہ ختم ہونے والے کام انجام دے۔ اس کے پاس کرنے کے لیے بہتر کام ہیں۔ ہیں ناں تمھارے پاس؟۔ مثلاً پہلے یہ معلوم کرنا ہے کہ پکاسو اور ٹولکین کون ہیں؟'

'میں تو ویسے ہی دل چسپی رکھتی تھی مریم' سلمیٰ نے احتجاج کیا' بہر حال، زندگی میں پکاسو اور ٹولکین کے بارے میں معلوم کرنے سے زیادہ اہم کام بھی ہیں۔'

'مثلاً کیا؟' مریم نے حیرت سے پوچھا جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا ہو

'مثلاً والٹز سیکھنا' سلمیٰ اپنی دوست کو دیکھ کر مسکرائی 'میں اسے والٹز کرنا سکھاتی رہی ہوں۔'

'ہوں، لگتا ہے پوری کہانی میرے علم میں نہیں ہے' مریم بولی' کیا تم اسے کسی رقص پارٹی میں لے جانے والی ہو؟ کیا اسے کچھ اور بھی سکھایا ہے تم نے؟ مجھے امید ہے کہ اس تمام نئے تہذیب یافتہ پردے میں وہ اچھا دیہاتی لڑکا ابھی زندہ ہے جس سے میں چند ہفتوں پہلے ملی تھی۔'

'تم دونوں چڑیلوں کی طرح باتیں کر رہی ہو، جنھیں ایک لقمہ تر مل گیا ہے، جسے ان میں سے ایک نگلنے ہی والی ہو' میں نے احتجاج کیا

'کھانے والی ہو؟' مریم نے احتجاج کی اداکاری کی' میرا تو خیال ہے کہ طعام ختم ہو چکا ہے۔۔۔'

'مریم!' سلمیٰ کراہی

'دیکھو حسن' مریم ایک مادرانہ شفقت سے بولی' اگر یہ تمھارے ساتھ بدتمیزی کریں، تو تم یہاں چلے آنا۔ یہاں تمھارے لیے ایک گھر موجود ہے۔'

ہم دوبارہ لنچ کے لیے اس انڈین ریسٹورانٹ میں گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے مریم کسی زنداں سے رہا ہوئی ہو، وہ مستقل بولتی رہی، سلمیٰ کو چھیڑتی رہی اور اسے دوسرے گاہکوں کے متعلق کہانیاں سناتی رہی۔ اس نے ہمیں اپنے بھائی کے بارے میں بتایا جو کسی بھی دن امریکا سے واپس آنے والا تھا۔ اس نے ایک امریکی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس کے والدین دکھ اور اضطراب کے جذبات کے ساتھ اس کے منتظر تھے۔ لیکن جو خوشی انھیں ہونی چاہیے تھی وہ مفقود تھی۔

'اس میں تمھارے لیے سبق ہونا چاہیے' وہ مجھ سے بولی' اپنے والدین کی زندگی میں

مشکلات پیدا مت کرنا۔ اس کُرّے میں گھومتے ہوئے جو عورت ملے اسے وہیں استعمال کر لینا، اس سے شادی کی حماقت مت کر بیٹھنا۔ وہ غلط بات ہے۔ میرے خیال میں تم دنیا کی سیر کرو گے؟'

'کیسے؟' اس کی آواز میں دکھ تھا اور میرا دل اس ہم دردی پر مسرور ہو گیا

'یہ کوئی راستہ نکال لے گا؟ ہیں ناں، پکاسو!'

ہم نے اسے سڑک پر خدا حافظ کہا۔ مریم مقالے کی طرف لوٹنے پر منہ بنانے لگی۔ اس نے مجھے کبھی تنہا آنے کی دعوت دی۔

ہم گھنٹوں چلتے رہے، لیکن شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو۔ پارک کی ہوئی گاڑیوں سے گزرتے، ہوٹلوں کے دروازوں کے سامنے سے جاتے، ان دکانوں کو پیچھے چھوڑتے جہاں جم ریوز (Jim Reeves) اور ایلوس پریسلے کے ریکارڈ فروخت ہو رہے تھے، اور ساتھ ہی دوسری تمام چیزیں مثلاً جوتوں کے فیتوں سے لے کر ٹی وی سیٹ تک۔ کاسترو اور عیدی امین کی تصویروں والے رسالوں کو فروخت کرتے ہاکروں کے پاس سے۔ ہم نے بوڑھوں کو سڑک پر نشے میں مدہوش پایا۔ ہم سبز درختوں کے نیچے سے گزرے، فٹ پاتھ پر آرائشی جھنڈیاں لگی دیکھیں، اور موٹی آیاؤں کو بچہ گاڑی دھکیلتے دیکھا۔ ایک آدمی ایک بس کی چھت سے دنیا کے خاتمے کا اعلان کر رہا تھا۔ ایک پولیس اہلکار نے مستعد ہو کر ایک وزیر کی گزرتی گاڑی کو سلیوٹ کیا۔ ایک موٹر سائیکل سوار فٹ پاتھ سے انتہائی قریب سے گزرا۔ آخر ہم پارک میں ایک بنچ پر بیٹھ گئے سامنے سرکاری عمارتیں کھڑی تھیں۔ پھولوں سے لدی جھاڑیوں اور نمائشی درختوں نے ہمیں سڑک کی آنکھ سے اوجھل کر دیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے ہونٹوں تک بلند کیا اور اسے چوم لیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو شرگیں نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، کتنی جلدی۔۔۔' میں اتنا حیرت زدہ تھا کہ کچھ نہ کر سکا۔

'تم رک کیوں نہیں جاتے' اس نے نرمی سے پوچھا۔ اس کے سوال میں تحکم نہیں تھا بلکہ سمجھنے کی کوشش تھی۔

'کیوں کہ میں ملکیت نہیں بننا چاہتا۔ میرے مستقبل کا دارومدار اس امر پر نہیں ہونا

چاہیے کہ تمھارے والد میرے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ میں ان مینیجروں کی طرح نہیں بننا چاہتا جو تمھارے والد کے لیے کام کرتے ہیں۔ میں تمھارے والد کی طرف سے سخت دل نہیں ہو رہا۔ انھوں نے ساری زندگی اسی طرح کام کیا ہے۔ وہ اسی طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ میں اس کام کے لیے صحیح آدمی ہوں۔ ۔تم سمجھ رہی ہو ناں؟' میں ٹھیک سے نہیں سمجھا سکا۔ لیکن میں نامہربان نہیں ہونا چاہتا، کاش میں رک سکتا۔' وہ چاہتی تھی میں بولتا رہوں۔ مگر الفاظ میرے منہ سے نہ نکلے۔ مجھے اس قسم کے سین کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ جب میں نے اپنی سوچ کو الفاظ کا روپ دینے کی کوشش کی، تو وہ بیزار کن، جھوٹ کے لبادے میں ملفوف سنائی دے رہے تھے۔ 'کاش میں رک سکتا' میں نے دہرایا

'میں بھی چاہتی ہوں کہ تم رک جاؤ' وہ میری مشکل پر مسکراتے ہوئے بولی 'لیکن تمھیں فوراً تو نہیں جانا ہے؟'

'نہیں' میں نے جواب دیا 'تم سے ملنا بہت خوب صورت تھا، تم مجھے یاد آؤ گی۔'

'شاید تم واپس آجاؤ' وہ بولی

'میں آؤں گا'

'تم نے کچھ دن پہلے ایک بات پوچھی تھی' وہ مجھ سے دور ہٹ کے بولی 'اور میں نے تمھیں جواب نہیں دیا تھا۔'

'تمھاری ماں کے بارے میں' میں نے کہا

'ان کا میرے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا' وہ بولی 'انھوں نے زہر کھا لیا تھا۔'

'ارے نہیں' میں نے اسے اپنی بانھوں میں لے لیا، وہ ایک آہ بھر کے مجھ سے لپٹ گئی۔ ایک لمحے کے بعد وہ علیٰحدہ ہو گئی اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی

'مجھے نہیں معلوم کیوں' وہ بولی 'لیکن مجھے اس بارے میں بولنے دو۔ میرے والد ان کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ جب میں چھوٹی تھی تو ان سے پوچھتی بھی تھی۔ وہ مجھے اس قسم کی باتیں بتاتے کہ ان کا تعلق ملنڈی (Malindi) سے تھا۔ ۔ ۔ اور یہ کہ۔ ۔ ۔ جب میں چھوٹی تھی تو خدا نے انھیں ہم سے لے لیا۔ ۔ اس قسم کی باتیں۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھے رہے ہیں۔ مجھے

پتا ہے کہ وہ سخت گیر اور بے صبر لگتے ہیں، وہ زود رنج اور ظالم بھی لگتے ہیں، لیکن وہ بہت اچھے ثابت ہوئے ہیں۔ وہ ایک اچھے آدمی ہیں' وہ بولی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

'ہاں مجھے معلوم ہے۔'

'علی اور وہ۔۔ علی بہت عرصے سے ہمارے ساتھ ہے۔ تم سمجھ رہے ہوگے کہ جس قسم کی حرکتیں وہ کرتا ہے۔۔۔۔ وہ بالکل خاندان کے ایک فرد کی طرح ہے۔ لیکن میرا نہیں خیال وہ بھی چیزوں کو اسی طرح دیکھتا ہے، وہ بہر حال ہے تو ملازم۔'

'تمھیں اپنی ماں کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟' میں نے پوچھا

'مریم نے معلوم کیا تھا۔ ہم ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ایک بڑی بہن کی طرح تھی۔ ان تمام برسوں انھوں نے اس سے بھی چھپایا تھا۔ بس منہ سے نکل گیا۔ اس کی ماں نے بتایا تھا۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے لوگ اس قسم کی باتوں کو کیسے راز میں رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ نہیں اگلوا سکی۔ اور میں نہیں جانتی کہ اپنے باپ سے یہ سوال کیسے پوچھوں۔ ہوسکتا ہے تم سمجھو میں بہت ڈرپوک ہوں'

'نہیں' میں نے کہا 'میں تمھاری بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں۔'

'میری ماں نے زہر کھالیا تھا اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اس بارے میں کیسے سوال کروں۔ میں انھیں مزید دکھ دینے سے بہت خوف زدہ ہوں۔ مجھے زیادہ خوف اس بات کا بھی ہے کہ وہ مجھے نہیں بتائیں گے۔ اور وہ مجھ سے کشیدہ ہو جائیں گے۔ کبھی کبھی تو وہ اتنے غصہ ور ہو جاتے ہیں، ان پر دورہ سا پڑ جاتا ہے۔۔'

'میری ماں نے مجھے انتباہ کیا تھا' میں نے مسکرا کے دیکھا

'واقعی؟' سلمٰی ہنستے ہوئے بولی۔ آنسو اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے 'ایسا نہیں کہ میرے لیے ان کے بارے میں مزید جاننا بہت ضروری ہے۔ میں ان کے لیے کچھ کر تو نہیں سکتی۔ لیکن انھیں سمجھنے کی خاطر۔۔۔ ہم دونوں کو۔۔۔ ہمارے تعلق کو۔۔۔ وہ اس دکھ کو چھپا رہے ہیں، اور وہ۔۔۔ وہ مجھے اس بارے میں بتاتے بھی نہیں۔ وہ اتنے برسوں سے اسی طرح کے ہیں، اور ابھی گزشتہ برس سے ہی میں سمجھنے لگی ہوں کہ ایسا کیوں ہے۔ وہ مجھے نہیں پوچھنے

دیں گے، میرا خیال ہے کہ مجھے پوچھنا چاہیے۔'

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں کے درمیان میں لے لیا۔

'اور اب تم نے یہاں آ کر چیزوں کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے' وہ میرے چہرے کو چھوتے ہوئے بولی۔ وہ ہنسی 'انھوں نے مجھ سے کہا تھا تم آ رہے ہو۔ ہم نے تمھارا بہت مذاق اڑایا تھا۔ انھوں نے مجھے تمھاری ماں کے بارے میں بتایا تھا۔ جب وہ دونوں بچے تھے۔ وہ سارے بیتے دن۔۔۔'

'انھوں نے تمھیں میرے والد کے بارے میں بھی بتایا تھا؟'

'ہاں' وہ بولی 'انھوں نے بتایا تھا'

'کیا انھوں نے ان کے جیل جانے کے بارے میں بھی بتایا تھا؟'

'ہاں' وہ بولی 'انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا'

'کیا انھوں نے بتایا تھا کہ میرے والد نے ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ اور وہ چھوٹا لڑکا نیم پاگل سا ہو گیا تھا؟ اور لوگ کہتے تھے کہ وہ چھوٹے لڑکے عربوں کو فروخت کرتے تھے۔ اور یہ کہ وہ ایک شرابی ہیں، اور جتنا زیادہ ممکن ہو اپنا وقت چکلوں میں گزارتے ہیں؟'

'ہاں' وہ بولی

'خدایا، تمھیں مجھ سے کیا امیدیں رہی ہوں گی!'

مجھے اچانک ان سے بہت ہمدردی محسوس ہوئی، اور وہ تمام دکھ جو میں نے ان کی زندگی میں گھول دیا تھا۔ انھیں کس قدر بے وفائی لگی ہوگی کہ ان کا اپنا لڑکا ان کے بارے میں ایسے سرد جذبات رکھتا ہے۔

'ہمیں ایک مسخرے کی امید تھی' سلمیٰ بولی 'ہمیں ایک ایسے شخص کا انتظار تھا جس کا ہم مذاق اڑا سکیں، لیکن نکلے تم' اس نے ہنستے ہوئے دوبارہ مجھے چھوا۔ 'اب انھیں غلطی کا احساس ہوتا ہے۔ انھیں تمھیں بلانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہ تمھاری مدد نہیں کر سکتے، یہ تم جانتے ہو، جانتے ہو ناں؟ انھوں نے بہت سخت وقت گزارا ہے۔ تم ان مینیجروں کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔

انھوں نے دھوکا دیا تھا۔ یہ سب مینیجر نئے ہیں۔ سب چوری کرتے ہیں۔ اب وہ یہ جانتے ہیں کہ انھیں تم کو مدعو نہیں کرنا چاہیے تھا۔'

'اس سے فرق نہیں پڑتا' میں نے کہا' میں یہاں آتے ہی سمجھ گیا تھا، تم دونوں نے سمجھا دیا تھا۔'

'میں بہت شرمندہ ہوں' وہ بناوٹی ندامت سے بولی

'نہیں، جب میں آیا تھا تو مسخرا ہی تھا۔ ان وجوہات سے نہیں جو تم سمجھ رہی تھیں۔ وہ سب بریانی کا ڈرامہ، میرا خیال ہے کہ وہ سب میں نے اپنے لیے کر لیا تھا۔ میں ایسا اوچھا ہو گیا تھا کہ میں غیر سنجیدہ ہونے کی اداکاری کر سکتا تھا۔ شاید ایسا ہے کہ میں جس خیراتی مشن پر تھا اپنے آپ کو اس سے بہت بلند سمجھ رہا تھا۔ لیکن میں بہت خوش ہوں کہ یہاں آیا اور تم سے ملاقات ہوگئی۔ میں کچھ دوسری وجوہات سے بھی خوش ہوں کہ یہاں آیا۔ مجھے صرف یہی دکھ ہے کہ مجھے جانا ہوگا، اور میں تمھیں نہیں دیکھ سکوں گا۔'

'لیکن تم واپس آؤ گے۔'

'ہاں میں واپس آؤں گا۔'

'تم کیا کرو گے؟' وہ پوچھنے لگی

'مجھے نہیں معلوم۔ میں گھر واپس جاؤں گا۔۔۔ اور کوئی راہ نکالوں گا۔'

جب ہم نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو تاریکی چھانے لگی تھی۔ میں گھر جانے سے کترا رہا تھا۔ اس نے سنیما تجویز کیا۔ مجھے ڈر تھا کہ ہمیں دیر ہوگئی تو بوانا احمد کیا کریں گے۔ لیکن وہ اس بابت فکر مند نظر نہیں آتی تھی

'جب تم جاؤ تو لکھنا ضرور' وہ بولی

'بالکل لکھوں گا' میں نے کہا سڑک کی روشنی مجھے اس کو بانھوں میں لینے سے مانع رکھ رہی تھی۔ سنیما میں فلم لگی تھی 'ایک انگریز افیونچی کا اقرارِ جرم' ہم نے سوچا کہ یہ بہت بکواس ہے، لیکن دونوں کو بیت الخلا کی سخت ضرورت تھی۔ ہمیں محض بیت الخلا کے استعمال کی عیاشی کے لیے دو ٹکٹ خریدنے پڑے۔ لیکن قیمت وصول ہوگئی۔ فرش پر قالین بچھا ہوا تھا، اور ہوا کھینچنے والا

پنکھا دھیمی آواز میں چل رہا تھا۔ فضا میں پرفیوم کی خوش بو بسی تھی۔

بس میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامنا حماقت لگ رہا تھا اور پھر ہماری کہنیاں بھی آڑے آرہی تھیں۔ بس تقریباً خالی تھی، لیکن پھر بھی ہم سرگوشی میں گفتگو کرتے رہے۔ آخر کار اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا اور میں نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ ہم کتنی جلدی پہنچ گئے۔ ۔ گھر کے راستے پر چلتے ہوئے وہ مجھ سے ذرا فاصلے پر ہو گئی۔ اب شام کے آٹھ یا نو بج رہے ہوں گے، سوائے کھڑکیوں سے چھنتے روشنی کے مربعوں کے ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ جب وہ تالے سے الجھ رہی تھی تو میں اس کے عقب میں کھڑا رہا۔ دروازہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا گیا، اس کے والد ہمارے سامنے کھڑے تھے، غصے کا ایک پہاڑ سامنے تھا۔

'کہاں تھیں تم؟' وہ دانت پیس کے بولے 'ادھر آؤ تم'

انھوں نے غصے سے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔ جب سلمیٰ ان کے پاس سے گزر کے آگے بڑھی تو انھوں نے خاصی قوت سے اس کے سر کی پشت کو دھکا دیا۔ وہ آگے کی جانب لڑکھڑائی، پھر ان کا سامنا کرنے کے لیے مڑی، اس کا منہ دکھ اور حیرت سے کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ انھوں نے آگے بڑھ کے اس کے رخسار پر ایک طمانچہ مارا۔ وہ دوبارہ لڑکھڑا گئی، درد کی شدت سے وہ رو رہی تھی۔ 'تم یہ کیسے کر سکتی ہو؟ ہر چیز کے بعد تم یہ کیسے کر سکتی ہو؟' وہ چلائے۔ وہ اپنا سر تھام کے غرائے۔ اس نے اپنا سر ہلایا، اب آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

'ڈیڈی' وہ ان کی جانب بڑھی۔ انھوں نے سر اٹھا کے دیکھا، ایک قدم آگے بڑھ کے اس کے قریب ہوئے اور اس کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ اس کا پورا چہرہ حیرت اور خوف سے سکڑ گیا۔ اس کے منہ سے خون بہنے لگا۔

'اپنے کمرے میں جاؤ' وہ دھاڑے 'جاؤ'

وہ اس کی جانب سے رخ پھیر کے مڑ گئے۔ وہ اپنے چہرے کو ہاتھوں سے رگڑنے لگے، گویا جو انھوں نے دیکھا تھا اسے صاف کر سکیں۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی، سسکیاں لیتی،

خون اس کی باچھوں سے بہتا رہا۔ انھوں نے اس کی جانب اپنی پشت کرلی۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لیا تا کہ اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ سکے۔

'جاؤ' وہ گڑگڑائے

انھوں نے اسے تیزی سے بیٹھک کے دروازے کی جانب جاتے دیکھا، پھر میری جانب مڑے۔ ان کا چہرہ نفرت سے خوں خوار لگ رہا تھا۔ انھوں نے مٹھی فضا میں بلند کر کے میری جانب لہرائی وہ الٹے قدموں بیٹھک کی جانب بڑھے۔ 'آؤ' انھوں نے کندھے پر سے آواز دی۔

'بیٹھو' وہ کھڑکیوں کے سامنے پھرتے ہوئے بولے۔ میں نے ان کی ہدایت ان سنی کر دی

انھوں نے مجھے گھورا۔ وہ غصے سے پھٹنے والے تھے، چیخے 'بیٹھ جاؤ!'

میں بیٹھ گیا۔ وہ چند منٹ مزید ٹہلتے رہے۔ جہنم میں جائیں یہ، میں نے سوچا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے کے وسط میں رک گئے۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے تھے۔

'تم ایک جانور ہو' وہ دانت پیس کر اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے

میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ میں خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں پہلے بھی ایسے حالات سے گزرا ہوں، میں اپنا دفاع کر سکتا ہوں۔ میرے خدا، میں نے سوچا، جب وہ اس بارے میں سنیں گے تو؟

'تم کس قسم کے قابلِ نفرت جانور ہو؟' وہ چیخے۔ غصے سے بل کھاتے انھوں نے پھر ٹہلنا شروع کر دیا۔ وہ کچھ دیر کے بعد مجھ پر نگاہ ڈال لیتے، جیسے میں ان کے فرش پر رینگتا کوئی کیڑا تھا۔ آخر وہ مڑے اور انتہائی غصے سے سر ہلاتے ہوئے بولے 'غلطی میری تھی، میں مانتا ہوں۔ مجھے تم کو یہاں نہیں بلانا چاہیے تھا۔ یہ میری غلطی تھی۔ میں نے اپنی پوری کوشش کی۔۔۔ جیسے۔۔۔ جیسے تم ہمارے اپنے ہو۔ میں نے تم کو بلانے کی غلطی کی تھی، لیکن پھر میں نے کوشش کی کہ۔۔۔ میں نے تمھیں نوکری کی پیشکش کی۔ میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔ تمھیں یہ کرنا ضروری تھا؟ کیا ہمارے سلوک کا یہی جواب تھا۔ میں نے تم پر اپنے گھر کے دروازے کھول دیے، تمھیں

خوش آمدید کہا۔ ۔ ۔ اور تم نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ تم نے میری بیٹی کی بے عزتی کی۔ تم نے میرے نام کی، میرے خون کی بے عزتی کی۔ میں تمھیں روک رہا تھا، مجھے تم کو روکنا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنا گر سکتے ہو۔ کیا انھوں نے تمھیں کچھ نہیں سکھایا؟ کیا جہاں سے تم آئے ہو وہاں تمھیں کچھ تہذیب نہیں سکھائی گئی۔ تم ایک شخص کے گھر پر رہو اور پھر اس کی بیٹی کی بے حرمتی کرو۔ میرے خدا میں کبھی سبق نہیں سیکھتا۔'

مجھے یقین ہو گیا کہ اب مار پیٹ کی نوبت نہیں آئے گی۔ مجھے چپ رہ کر ان کا غصہ برداشت کرنا ہوگا، اور پھر انھیں سمجھانے کی کوشش کرنی ہوگی۔ انھوں نے مجھے گھورا، گویا کہہ رہے ہوں، بول کے دیکھو۔ 'تم ایک جانور ہو' وہ بولے، پھر ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔ 'تم ایک جانور ہو، میں کبھی سیکھتا کیوں نہیں؟ براہ کرم اپنا سامان اٹھاؤ اور نکل جاؤ۔ ابھی، مہربانی کر کے ابھی! مجھے جا کر اپنی بیٹی کو دیکھنا ہے' وہ اچانک دوبارہ چیخنے لگے 'کیا تم کچھ اور کرنے کے بارے میں نہیں سوچ سکتے؟ تم ایک چاقو لے کر مجھے کیوں نہیں گھونپ دیتے؟ نکلو میرے گھر سے، نکل جاؤ!' ان کے پہلو میں ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، ان کے بازو ہل رہے تھے۔ ان کا چہرہ غصے سے بگڑا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا انھیں روکوں، انھیں سختی سے جھنجھوڑوں اور دیوار کے ساتھ لگا دوں۔ میں چاہتا تھا کہ انھیں بتاؤں اگر اب وہ درد محسوس کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں اس بات کا ادراک ہے کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں۔ یا انھیں یہ حق ہے کہ لوگوں کو پیٹتے رہیں۔ ان کی حقیر غنڈہ گردی اس سے زیادہ نقصان پہنچا رہی تھی، جتنی ایک احمق آدمی کے بس میں ہونی چاہیے۔

'میں نے کچھ نہیں کیا' میں شروع ہوا۔

'میں تم سے ایک لفظ نہیں سننا چاہتا' وہ چلائے

'اور آپ کی بیٹی نے بھی کچھ نہیں کیا'

'اپنا منہ بند کرو، بس اپنا سامان اٹھاؤ اور نکل جاؤ، ابھی! میں تم سے کوئی صفائی، کوئی عذر نہیں سننا چاہتا۔ میں تمھارے باپ سے رابطہ کروں گا۔ انھیں یہ سب بتاؤں گا۔ وہ یہ سب سن کر یقیناً بہت فخر محسوس کریں گے۔' وہ کچھ دیر مجھے خاموشی سے گھورتے رہے۔ انھیں مزید کچھ کہنے

کی ضرورت نہیں تھی لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ میرے باپ کا نام درمیان میں لانے سے ان کا کیا مطلب ہے، اس قسم کے آدمی کی اولاد سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

'آپ لوگوں کو بلا وجہ تکلیف پہنچاتے ہیں' میں بولا 'یہ سب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سلمیٰ کو مارنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'

وہ غرا کے آگے بڑھے 'اگر تم میری بہن کے بیٹے نہیں ہوتے تو میں تمھیں قتل کر کے نتائج بھگت لیتا'

'مار دیں مجھے۔ اگر یہی درست ہے تو اپنی بہن کو درمیان میں مت آنے دیں۔ مجھے آپ کی کسی حرکت سے خوف نہیں آتا۔ میں نے آپ کی بے عزتی نہیں کی، آپ نے خود اپنی بے عزتی کی ہے۔'

'آہ، نکل جاؤ' انھوں نے دھکا دے کر مجھے ایک طرف کیا 'وہاں اپنے مجرم باپ کے پاس جاؤ۔ وہ غلیظ آدمی سمجھ جائے گا کہ تم نے کیا کیا ہے۔' انھوں نے فرش پر تھوکا اور مجھے دروازے کی طرف دھکیلا۔

'میری بات سنیں' میں نے کہا اور رک کے ان کی طرف مڑا 'آپ ایک احمق انسان ہیں، اور میری دعا ہے آپ کا خدا آپ کو ان حرکتوں پر معاف کرے۔ آپ اپنی بیٹی کے لیے ایک زندان تعمیر کر سکتے ہیں، لیکن میں اس کے لیے واپس آؤں گا۔'

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہاں خاموش، بے حرکت کھڑے مجھے گھورتے رہے۔ میرا نچلا ہونٹ کانپ رہا تھا اور میری خدا سے دعا تھی کہ میرے آنسو نہ نکلیں۔ میں برآمدے سے اپنے کمرے کی جانب بڑھا تو وہ میرے تعاقب میں تھے۔ سلمیٰ کا دروازہ بند تھا۔ میں رکے بغیر اس کے سامنے سے گزر گیا۔ میں نے اپنی چند چیزیں جمع کیں اور ایک بیگ میں ٹھونس دیں۔ بستر پر ایک رقعہ پڑا تھا۔ میں نے وہ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ بوانا احمد خلیفہ دروازے پر کھڑے مجھے دیکھتے رہے۔ انھوں نے اپنی انگلی کے اشارے سے مجھے جانے کے لیے کہا۔

وہ میرے ساتھ رہے تا کہ میں اس سے نہ مل سکوں۔ میں ان کے پاس سے گزرا تو میری گردن کسی گھونسے کی توقع میں جل رہی تھی۔ وہ صدر دروازے تک میرے تعاقب میں آئے، اور جب تک میں سڑک پر نہ پہنچ گیا وہ وہیں کھڑے رہے۔ مجھے روکنے کوئی بھاگ کر باہر تو نہ آیا لیکن اس رقعے نے مجھے امید دلائی۔

میں بس کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چلنے کے دوران سوچنا چاہتا تھا۔ میں اپنی نفس کشی کرنا چاہتا تھا۔ میں بھوک اور تھکاوٹ کا مارا بس چلتے رہنا چاہتا تھا، جس کے تعاقب میں غصیلے کتے لگے تھے۔ شاید مجھے کھلے آسمان کے نیچے سونا پڑے۔ لٹیروں کے ہاتھوں پٹنے اور ڈکیتی کا نشانہ بننا پڑے۔ دو کاریں قریب سے گزریں اور قریب سے گزرتے ہوئے دونوں نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ دور کوئی رویا، اس کی غنا طول کھینچ گئی، ہلکی برش ہونے لگی۔ بارش نے جلد ہی اپنا رویہ بدلا، اور اب سخت، موٹے قطرے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ پکاسو اس موقع پر کیا کرتا؟ کیا وہ واپس چلا جاتا؟ میں نے جیب میں اس رقعے کو چھوا۔ میں سڑک کے وسط میں کھڑا مزید بارش کے لیے چیخنے لگا۔ شب کے طولانی منظر میں ایک مغموم شخص۔ بارش اور سختی سے برسنے لگی۔ میرے دکھ کو بانٹتی رہی، مجھے آگے بڑھنے پر اکساتی رہی۔ شاید نیروبی میں مجھے فٹ پاتھ پر سجاوٹ کی چیزیں فروخت کرنے کی نوکری مل جائے۔ شاید موسیٰ مجھے ساجھے دار بنا لے۔ اس طرح واپس لوٹنے سے تو کچھ بھی بہتر تھا۔ میں نے شب کی تاریکی میں سلمیٰ کا نام پکارا، کیا یہ مجھے مزید دکھی کر دے گا، ایسا ہی ہوا۔ تو میں نے دوبارہ مزید جذبے کے ساتھ پکارا۔

اپنے لوگوں میں لوٹ جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور جب میں واپس لوٹوں گا تو وہ مجھے اپنے اجداد کی کہانیاں سنائیں گے۔ وہ خدا کی پسندیدہ قوم، کہ جس پر راہ بھٹکنے کے دوران بارش برستی رہی، ظالم مسافر زمین کو بنجر کرتے رہے۔ وہ مجھے اپنے اجداد کی عظمتوں کی کہانیاں سنائیں گے، ان کی مملکتوں اور فتوحات کی۔ اور میں خالی ہاتھ لوٹا ہوں جب کہ مجھے اسباب کے انبار لانے چاہییں تھے۔ میں خالی ہاتھ لوٹا ہوں جب کہ وہ تو ہاتھی دانت اور جنسی قوت بڑھانے والے سینگ لے کر لوٹے تھے۔ جو تھوڑا بہت ممکن تھا میں اس میں بھی ناکام رہا تھا۔ کوئی اس عورت کا تذکرہ نہیں کرتا جسے وہ اس تپتے جزیرہ نما میں پیچھے چھوڑ آئے تھے، یہ خدا

کے منتخب لوگ۔ بلاشبہ وہ اپنے بے رحم عقیدے کے ہاتھوں کم زور ہوئے، کہ خدا نے انھیں سیاہ فام کافر غلام بنانے کے لیے فراہم کیے، کہ جس سے ان کے شوہروں کی دولت میں اضافہ ہو۔ جب ان کے شوہر سیاہ فام علاقوں سے مالِ غنیمت اور کہانیاں لے کر لوٹتے، تو وہ اپنے حصے کے آبی ایام میں تولید کا بیج بوتیں۔ سالہا سال جب انھیں بانجھ پہاڑیوں اور زمین سے زندگی کھرچنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا توانھوں نے بکریوں کی طرح پتوں پر گزارا کیا۔ سیاہ ماتمی لباس میں ملبوس، آہ و بکا سے اپنی اولادوں کو پکارتیں، انتباہ کرتیں۔۔ ان بانجھ پہاڑیوں اور زمین سے کفر کو شکست دینے خدا کی چنیدہ مخلوق نے جنم لیا۔ انھوں نے اپنے نوجوان ہماری جانب بھیج دیے کہ ہمیں تباہ کر سکیں، ہمارے خون سے ہولی کھیل سکیں۔ خود میرے اجداد میں بے کس نمک فروش، ملاح اور مالشیے ہیں۔ جس میں خاصی ردو کد کے بعد سیاہ فام خون کی آمیزش کا اقرار کیا گیا ہے۔ افتخار، افتخار، ان میں کوئی مصور نہیں تھا کہ جو ہمارا نام زندہ رکھتا۔

ایک کار بارش میں رک گئی، اس کا انجن میرے برابر گرجتا رہا۔ اسٹیرنگ کے پیچھے ایک یورپین بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے انکار میں سر ہلا کے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ان مہربان یورپین کے ہاتھوں لفٹ لینے والوں کے ساتھ کج روی کی بہت کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اس نے شانے اچکائے، ہاتھ اٹھا کے خدا حافظ کہا اور چل دیا۔

میں نے وہ رقعہ تلاش کیا۔ بارش اب زحمت بن گئی تھی۔ تاریکی مجھ سے میری محبوبہ کے الفاظ مستور کر رہی تھی! درد اور موت کی اتنی گفتگو کے بعد! مجھے اس خاموشی میں وہ الفاظ تلاش کرنے ہوں گے جو کبھی ادا نہیں کیے گئے۔ میں نے ذرا دور فاصلے پر کچھ روشنی دیکھی۔ اس رقعے کو پڑھنا اچانک بہت ضروری ہو گیا تھا۔ میں بارش میں دوڑنے لگا۔ راستے میں کتے میری راہ میں بھونکے میں ان پر چیخنے لگا۔۔ جب میں روشنی کے پاس پہنچا تو ایک پولیس کار قریب آ کر رکی۔ پرانے خوف لوٹ آئے، میں بھگتنے کے لیے رک گیا۔

'میں ریلوے اسٹیشن تک جا رہا ہوں' میں نے ثبوت میں اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے خود ہی رضا کارانہ بیان دیا۔ جب میں نے اپنا بیگ بلند کیا تو وہ ایک چور کے اوزاروں کے بیگ سے زیادہ اور کسی چیز سے مشابہہ نہیں تھا۔ پولیس والوں نے اس میں زیادہ دل چسپی نہیں لی۔ 'ہم

اس طرف نہیں جا رہے' ان میں سے ایک بولا۔ انھوں نے آپس میں کچھ گفتگو کی اور چلے گئے۔ ڈر رہے ہوں گے کہ کہیں میں لفٹ نہ مانگ لوں۔

میں نے احتیاط سے وہ رقعہ کھولا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنی جلد بازی میں اس کی گیلی تہوں کو توڑ مروڑ کے اس کی لئی نہ بنا دوں۔ اس نے لکھا تھا 'لکھنا مت بھولنا، س'۔ اس کے نیچے اس نے مریم کا نام اور یونی ورسٹی میں پورا پتا لکھا تھا۔ کل یہی تھا! کوئی جذباتی الفاظ، کوئی وعدے نہیں؟ کوئی خون سے لکھے پیماں نہیں ۔ لیکن اتنا بھی کافی تھا۔ میری پیاری زخمی سلمٰی۔ میں نے اسے کھویا نہیں تھا۔ میں نے کھمبے کے نیچے جمع پانی میں وہ رقعہ پھینک دیا۔ اس لمحے کی ڈرامائی نوعیت میں یہی مناسب تھا۔ میں آس پاس کوئی نشانی ڈھونڈنے لگا کہ اس جگہ کو یاد رکھ سکوں میں نے اسے ایک مزار بنا لیا، کہ جب میں اسے حاصل کرنے آؤں تو یہاں زیارت کے لیے آسکوں۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور شہر کی روشنیوں کا رخ کیا۔

میں وسطِ شب میں اسٹیشن پہنچا۔ دروازے بند تھے، لیکن صبح سویرے کے جنجا اور کمپالا کے مسافر برآمدوں میں سو رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ساحلی ٹرین کل شام نکل گئی۔ میں اس بے آرام زمین پر لیٹ گیا۔ ۔ لیکن وہ دو آدمی جنھوں نے مجھے ریل کے بارے میں بتایا تھا مجھے ہراس کرنے لگے۔ پہلے تو وہ پیسے مانگتے رہے، پھر دھمکانے پر اتر آئے۔ میں ان کے پاس سے اٹھ کر گیٹ کے قریب چلا گیا جہاں زیادہ لوگ تھے۔ ایک خاندان کے قریب جگہ تلاش کر کے میں وہاں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جب کچھ روشنی ہوگئی تو میں یونی ورسٹی کی تلاش میں نکل گیا۔ جب تک کچھ چہل پہل نہ ہوگئی میں یونی ورسٹی کے گیٹ کے پاس انتظار کرنے لگا۔ جب میں نے دروازہ بجایا تو مریم بستر میں ہی تھی۔ اس نے ذرا سی جھری پیدا کر کے باہر جھانکا۔

'کیا ہوا؟' اس نے آنکھیں مل کے نیند بھگانے کی کوشش کی 'ابھی ایک گھنٹے پہلے ہی آنکھ لگی تھی۔'

'میں شرمندہ ہوں' میں نے کہا 'میں صرف تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا، میں بعد میں آجاؤں گا۔'

'کیا کچھ ہو گیا ہے؟' وہ اچانک متوجہ ہو گئی

'انھوں نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے' میں اپنے بے تکے پن پر خود ہی مسکرا دیا۔

'خدایا' وہ کراہی 'مجھے ایک منٹ دو۔' ہم ناشتے کے لیے کیفے گئے اور میں نے اسے بتایا کہ کیا ہوا تھا۔

'وہ احمق آدمی' وہ بولی 'تمھیں نہیں معلوم اس شخص نے کیا کیا ہے۔ مجھے تو سلمٰی کو بتانے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ تم مجھے بھیجنا اور میں خط اسے پہنچا دوں گی۔ اس سے خوف زدہ مت ہونا۔'

'کیا مطلب ہے تمھارا، کیا کیا ہے انھوں نے؟'

اس نے مجھے سلمٰی کی ماں کے بارے میں بتایا کہ ان پر کیا گزری۔ پہلے تو وہ بتانے میں ہچکچا رہی تھی۔ لیکن جب شروع ہوئی تو خود ہی اپنی کہانی میں ملوث ہوتی گئی 'ان کا دوست، مجھے نام نہیں معلوم، ان کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی یوگنڈا سے آیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو بچپن سے جانتے تھے۔ کچھ ایسی مشکل پیدا ہوئی تھی کہ اس کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا یا ایسا ہی کچھ تھا۔ میرے خیال میں شاید اسے جیل بھی جانا پڑا تھا۔ بہر حال انھوں نے اسے روک لیا، وہ ان کے پاس مہینوں ٹھہرا۔ پھر انکل احمد کو پتا چل گیا کہ وہ ہم بستری کر رہے ہیں۔ ان پر غصے کا دورہ پڑ گیا، وہ اپنے دوست سے بہت لڑے۔ میرے خیال میں انھوں نے اسے بری طرح زخمی کر دیا تھا، چاقو یا ایسی کوئی چیز تھی۔ پھر انھوں نے سلمٰی کی ماں کو ایک کمرے میں بند کر دیا۔ لوگوں کو ان کے دوست سے پتا چلا جو اپنی بے گناہی پر مصر تھا۔ احمد انکل کبھی باہر نکلتے نہ ہی نوکری پر جاتے۔ وہ بس گھر پر رک کے اپنی بیوی کی چوکی داری کرتے۔ میری والدہ بتاتی ہیں کہ چند لوگوں نے جا کر ان سے ملنے کی کوشش کی تھی، کہ انھیں اس پاگل پن سے باز رکھ سکیں، لیکن انھوں نے کسی سے بھی ملنے سے انکار کر دیا۔ کسی نے سلمٰی کی ماں کو ایک کھڑکی میں دیکھا۔ گندے بال، چیتھڑے لٹکائے، شاید ان کا دماغی توازن بگڑ گیا تھا۔ آخر میں پولیس آئی اور انھیں ہسپتال لے گئی۔ جب تک انھوں نے اسے چھوڑا انکل احمد ٹھنڈے پڑ گئے تھے، لیکن ان کے لیے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ ہر چیز سے بہت خوف زدہ رہتیں۔ وہ انھیں تنہا کسی کے پاس

نہیں جانے دیتے۔ آخر انھوں نے زہر پھانک لیا۔ میرے خیال میں اس وقت تک ان کا ذہنی توازن بگڑ چکا تھا۔ امی بتاتی ہیں کہ کسی پاگل کی طرح ان کی رکھوالی کے لیے کسی کو رکھنا پڑا تھا۔ امی نے انھیں مرنے سے کچھ ہی دن پہلے ایک بار دیکھا تھا۔ وہ عید کا دن تھا اور میرے ماں باپ عید مبارک کہنے وہاں گئے تھے۔ امی کو بیت الخلا کی ضرورت ہوئی، جب وہ اندر تھیں تو انھیں لگا کہ باہر کوئی ہے۔ جب وہ باہر نکلیں تو دیکھا کہ وہ سلمیٰ کی ماں تھیں۔ وہ بہت پراگندہ حال تھیں لیکن بہت ناخوش نہیں لگ رہی تھیں۔ تمھیں پتا ہے ناں کہ ہم کیسے پاگل رشتہ داروں کو گھر میں قید رکھتے ہیں۔ اور انھیں یہی خیال ہوا کہ شاید سلمیٰ کی والدہ بھی ان میں سے ایک ہیں۔ پھر انھوں نے زہر کھا لیا۔ جب تک انھوں نے مجھے نہیں بتایا، مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سلمیٰ کو کیسے بتاؤں۔ لیکن کسی کو تو بتانا چاہیے۔ وہ تو بتائیں گے نہیں۔ میرے خیال میں وہ ایک دن خود کو ہلاک کر لیں گے۔

'تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو؟' میں نے پوچھا

'بس کہہ رہی ہوں' وہ بولی 'مجھے نہیں معلوم کیوں، لیکن میرا نہیں خیال کہ وہ اس احساسِ جرم کے ساتھ زندہ رہ سکیں گے۔ ایک دن سلمیٰ کو پتا چلے گا اور پھر وہ جن نظروں سے انھیں دیکھے گی، وہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اب وہ اس کے لیے زندہ رہتے ہیں، اس کے ذریعے کفارہ ادا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایک دن اسے معلوم ہو جائے گا۔ اور وہ اسے مارتے ہیں۔ وہ احمق آدمی کتنے کرب سے گزر رہا ہے۔'

'معاف کرنا مجھے بالکل معلوم نہیں تھا، میرے خیال میں، میں نے معاملے کو اور الجھا دیا ہے۔' میں نے کہا

'نہیں تم نے ایسا کچھ نہیں کیا' وہ مسکرا کے بولی 'لیکن تم بہت خوش قسمت ہو کہ وہاں سے زندہ بچ کر نکل آئے۔ تم بہت خوش قسمت ہو پکا سو۔ تم اس کے لیے نیک شگون تھے۔ مجھے نہیں معلوم کیسے لیکن میرے خیال میں تم اس کے لیے تازہ ہوا کا ایک جھونکا تھے۔ اسے معلوم ہونا چاہیے۔ انھیں خود آپس میں اسے سلجھانا ہے۔'

'کیا تم اسے بتاؤ گی؟'

اس نے سر ہلایا 'مجھے نہیں معلوم' وہ بولی 'میں کل اس سے جا کر ملوں گی، بات کروں گی، اسے بتاؤں گی کہ میں تم سے ملی تھی۔'

'اس سے کہنا میں لکھوں گا' میں نے کہا

'آہا؟ کیا تم اتنا ہی کر سکتے ہو؟' مجھے یقین ہے پکاسو کہ تم نے اس سے بہت زیادہ دل چسپ پیغام سوچ رکھا ہوگا۔ چلو چھوڑو، میں خود ہی کچھ گھڑ لوں گی۔'

وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی۔ جب وہ کام پر لائبریری گئی تو میں نے سونے کی کوشش کی۔ سہ پہر میں وہ مجھے چھوڑنے اسٹیشن تک آئی، وہ پر اعتماد طریقے سے مجمعے سے نبٹتی ٹرین میں اوپر آگئی۔ اس نے ایک خالی نشست تلاش کرنے میں میری مدد کی، اور گاڑی چلنے تک میرے ساتھ بیٹھی رہی۔

'اب تم کیا کرو گے؟' اس نے پوچھا

'مجھے نہیں معلوم' میں نے جواب دیا 'ہر چیز اتنی مشکل لگ رہی ہے۔ پہلے تو جا کر یہ سب اپنے والدین کو سمجھانا ہوگا۔ مجھے پتا ہے ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ پھر خود اپنے لیے کچھ تلاش کرنا ہوگا۔ شاید میں ڈاک خانے یا گودی میں کوئی کام دیکھ لوں گا۔۔۔'

اس نے میری ران پر ہاتھ مارا 'اپنے آپ پر رحم کھانا بند کرو' وہ بولی 'واپس جاؤ اور جو بتانا ہے وہ انھیں بتاؤ نوجوان پکاسو۔ پھر نکل کر دنیا فتح کرو۔ لکھنا مت بھولنا' چلتے وقت اس نے میرے گال کا بوسہ لیا۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ فربہی مائل، سادہ لیکن بہادر لڑکی، ایک نئے دوست کے ملنے پر میں مسرور تھا۔

(۵)

انھوں نے مجھے اپنے سامنے صحن میں کھڑے دیکھا تو ہنس پڑیں۔ وہ اٹھنے لگیں تو میں نے جھک کر ان کے سر پہ بوسہ دیا۔ انھوں نے میرا نام پکارا جیسے وہ ایک خوش گوار حیرت کے ساتھ مجھ سے احتجاج کر رہی ہوں۔ جب انھوں نے دوبارہ سر اٹھا کر مجھے دیکھا تو ان کی آنکھیں سوالات سے کشادہ تھیں۔

'میں واپس آ گیا ہوں' میں نے اپنے بازو وا کر دیے۔

'ہاں، میں دیکھ رہی ہوں' وہ بولیں اور کچھ دیر میرے بولنے کی منتظر رہیں۔ انھوں نے کوئی سوال نہیں کیا، انھیں پتا تھا کہ میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہوگی۔ وہ عجلت میں اٹھیں کہ میرے لیے کھانا گرم کر دیں، اور نہانے کے لیے پانی گرم کر دیں۔ جیسی وہ مجھے یاد تھیں اس سے کم تھکی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ وہ اپنی آمد کی خبر نہ دینے پر مجھے ڈانٹنے لگیں۔

'میں جلدی میں نکل آیا' میں اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا۔

'کیا ہوا تھا' اپنے لباس سے ہاتھ خشک کرتے ہوئے وہ قریب ہو گئیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھنے لگیں، جب کہ میں نے بے پروا نظر آنے کی کوشش کی 'تم وہاں سے جلدی میں کیوں نکلے؟'

'میں آپ کو بتاؤں گا' میں بولا 'میں آپ کو سب بتادوں گا۔'

'ہاں، پہلے تم نہا کر کچھ کھالو' وہ جلدی سے بولیں، عجلت کرنے پر وہ خود سے خفا ہو رہی تھیں 'پھر ہم بات کریں گے۔ تم ٹھیک ہو، تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'

'سر میں درد ہے' میں سر کو چھوتے ہوئے بولا 'ریل کی وجہ سے ہوا ہے، کتنا شور ہوتا ہے!'

وہ مسکرائیں اور بڑھ کے میری کنپٹیاں سہلانے لگیں جیسے ڈر رہی ہوں کہ مجھے ٹھیس نہ لگے۔ سعیدہ آنکھیں ملتی پچھلے دروازے پر نمودار ہوئی۔

'اوہ یہ تم ہو' وہ بولی 'تم واپس آگئے۔'

'ہاں اور تمھیں دیکھ کر مجھے بھی بہت خوشی ہوئی' میں نے اس پر ہنستے ہوئے کہا۔ اس نے ایک خوف زدہ سی آواز نکالی اور واپس گھر میں گھس گئی۔

'اتنا شور مت مچاؤ' میری والدہ سرگوشی میں بولیں 'بی مکبوا کی طبیعت خراب ہے۔ انھوں نے بستر سے گر کے خود کو چوٹ لگا لی ہے۔ وہ ہسپتال بھی نہیں جانا چاہتیں۔ کہتی ہیں کہ اس انڈین ڈاکٹر سے کہو یہاں آئے، تمھیں یاد ہے وہ؟ ڈاکٹر منہا۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ مگر پھر بھی نہیں جانے پر تیار ہوتیں۔ کہتی ہیں میں ٹھیک ہوں۔ مگر وہ ٹھیک نہیں ہیں، ساری رات کراہتی رہیں۔'

'افسوس کی بات ہے' میں نے کہا 'ابا گھر پر ہیں؟'

'نہیں' وہ بولیں

'ذکیہ؟'

انھوں ایک کراہ اور غراہٹ کی کوئی درمیانی آواز نکالی۔ 'مجھے نہیں معلوم ہم اس کے ساتھ کیا کریں۔ وہ اب میری بات نہیں سنتی۔ تم شاید اس سے بات کرسکو۔ کچھ راتیں تو وہ گھر ہی نہیں آتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں؟' ان کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ کسی وقت بھی سسکنے لگیں گی۔ 'تمھارے جانے کے بعد وہ اور بگڑ گئی، تم ہی اس سے بات کرو، تم شاید اسے کچھ سمجھا سکو۔'

'ہاں کروں گا' میں بولا 'میں اس سے بات کروں گا۔ آپ دکھی مت ہوں۔ وہ اب بچہ تو

نہیں۔'

'یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟' وہ رونے لگیں 'وہ تو جیسے پاگل ہوگئی ہے۔'

'اماں، میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ دکھ کی بات نہیں، صرف یہ کہ وہ اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تو ہم اسے راہ راست پر نہیں لا سکتے۔'

'میں یہ قبول نہیں کر سکتی' وہ بولیں۔ انھوں نے مجھے ایسی تلخی سے مخاطب کیا کہ مجھے خواہش ہوئی کہ اپنے الفاظ واپس لے سکوں۔ انھوں نے آنکھیں بند کر کے ایک آہ بھری 'معاف کرنا، تمھیں خوش آمدید کہنے کا یہ طریقہ تو نہیں۔ لیکن ہم اسے چھوڑ تو نہیں سکتے۔'

'ہم نہیں چھوڑیں گے' میں نے کہا 'میں بات کروں گا اس سے۔۔۔'

'ہاں' وہ جلدی سے بولیں جیسے اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتی ہوں 'جاؤ جا کر نہا لو، میں تمھارا کمرا ٹھیک کر دیتی ہوں، پھر ہم باتیں کریں گے۔'

'کون سا کمرا' میں نے پوچھا 'مجھے کب سے کمرا مل گیا؟'

'بھئی اب تم ایک نوجوان آدمی ہو' وہ ہنستے ہوئے بولیں 'اور میں اس بات سے تھک چکی ہوں کہ صبح باہر آؤں تو دیکھوں کہ تمھاری دھوتی کھلی پڑی ہے، اور تمھاری چیزیں ہر طرف سے نکلی پڑ رہی ہیں۔ لہٰذا تم وہ چھوٹا مہمان خانہ لے لو۔'

'خیر یہ بہت عزت افزائی ہے۔'

'اب زیادہ بنو نہیں' وہ میرے بازو پر دھموکا جڑتے ہوئے بولیں۔ 'جا کر نہاؤ، جاؤ بھی میرے باپ، میں تمھارا کھانا تیار کرتی ہوں۔'

غسل خانے میں بدبو کے ایک جھونکے نے مجھے یاد دلایا کہ کیا عیاشی پیچھے چھوڑ کر آیا ہوں۔ لیکن اس میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا کہ میں اپنی ناک بند کر کے اس گندگی کی طرف سے آنکھیں بند کر لوں اور اپنے استقبال کی گرم جوشی کو یاد رکھوں۔ میں باہر نکلا تو دیکھا کہ اماں نے صحن میں ایک نئی چٹائی بچھا دی ہے۔ سعیدہ پہلے ہی اس پر لیٹ کر اونگھ رہی تھی۔ میں اس کے نزدیک بیٹھا تو اس نے کروٹ بدلی۔ 'یہ کہہ رہی تھی کہ تم سے مل کر صحیح طور پر تمھارا استقبال کرنا چاہتی ہے' میری والدہ بولیں 'اسے تو بستر میں ہونا چاہیے۔ بی مکسوا پھر کراہ رہی ہیں۔ یہ چھوٹی

بے چاری اسے مشکل سے برداشت کر پاتی ہے۔ مگر تمھاری دادی مصر ہیں کہ یہ وہیں ان کے پاس رہے۔ کہتی ہیں تنہا میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔'

سعیدہ اٹھ بیٹھی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ میری ماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور مہارت سے اسے اس کے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ سعیدہ احتجاج میں بھنبھنائی اور میری طرف مڑی:

'تم میرے لیے کوئی تحفہ لائے ہو؟' وہ بولی

'تم جیسی بدشکل کے لیے، نہیں، ظاہر ہے نہیں' میں بولا

اس نے ناقابلِ یقین بد ہیئت شکل بنائی، اور والدہ اسے گھسیٹ کر لے گئیں۔ اماں واپس لوٹیں تو آزردہ اور ناخوش تھیں 'وہ پھر کراہ رہی ہیں۔ یہ ایک بچے کے لیے مناسب نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سوئے' انھوں نے سرگوشی کی

'پھر اسے مت سلائیں۔ اگر وہ اتنی ہی بیمار ہیں کہ جیسی آپ بیان کر رہی ہیں۔ فرض کریں کچھ ہو جائے، فرض کریں۔۔۔'

'ایسا مت کہو' وہ درمیان میں بولیں 'مجھے جا کر ان کے ساتھ سونا ہوگا۔ سعیدہ ہمارے کمرے میں سو جائے گی۔'

میں نے ان کی جانب دیکھا تو انھوں نے نظریں جھکا لیں۔ مجھے وہ وقت یاد آیا کہ جب مجھے یہ عزت نصیب ہوئی تھی

'اسے آج میرے پاس سونے دیں' میں نے کہا 'کل ہم ایک گدا یا بچھونا لگا لیں گے۔'

'ٹھیک ہے' وہ کم زور سی آواز میں بولیں، سمجھ رہی تھیں کہ پرانی غلطیوں کے لیے میں انھیں الزام دے رہا ہوں

'تمھاری گھر واپسی زیادہ خوش گوار نہیں ہو رہی'

'میری گھر واپسی بہت اچھی ہوئی ہے۔ میں واپس آکر بہت خوش ہوں۔'

'کیا نیروبی بہت دشوار تھا، تم کسی مشکل میں تو نہیں پڑے؟ لیکن ٹھہرو، پہلے میں کھانا نکال دوں' انھوں نے مجھے پیاز والا آملیٹ اور بوفلو کے تین سلائس کاٹ کر دیے

'ہمارے پاس دودھ نہیں ہے، تم کالی چائے پی لو گے یا میں تمھیں کافی بنا دوں؟' وہ

بولیں

'کالی چائے ٹھیک ہے' میں بولا' کیا آپ اس میں کچھ ادرک ڈال سکتی ہیں، ادرک ہے کچھ؟'

'کالی چائے ادرک کے ساتھ، کیا یورپین یہی پیتے ہیں نیروبی میں؟ انھوں نے پوچھا

'نہیں' میں بولا' وہ تو کافی میں شکر اور دودھ ملا کر لیتے ہیں۔ آپ پی کر دیکھیے گا۔ تہذیب یافتہ لوگ یہی پیتے ہیں۔'

انھیں پتا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ وہ کس کی طرف دار ہیں، وہ مجھے بولنے کا حوصلہ دیتی رہیں۔'ابا کیسے ہیں؟' جب وہ آ کر میرے پاس بیٹھیں تو میں نے پوچھا

'وہ ویسے ہی ہیں' انھوں نے اپنے مانوس انداز میں منہ لٹکا لیا، جیسے ایک طویل آزمائش کے بعد صبر کر لیا ہو۔'وہ اب بھی اپنے آپ کو جوان سمجھتے ہیں۔ تمھیں پتا تو ہے وہ کیسے ہیں۔ شاید وہ مزید بگڑ چکے ہیں، مجھے نہیں معلوم۔'

'کیا مطلب ہے آپ کا؟' میں نے پوچھا' مزید کیسے بگڑ سکتے ہیں؟'

'تم انھیں جانتے تو ہو' وہ بولیں' اپنی کنپٹیوں کو انگلیوں کے پوروں سے سہلاتی ہوئے بولیں' وہ بہت زیادہ پیتے ہیں اور پھر قسمیں کھاتے ہیں کہ اسے چھوڑ دیں گے اور بہتر ہو جائیں گے۔۔۔ وہ نیک نیتی سے کہتے ہیں، اور رو کر اور قسمیں کھا کر۔۔۔' وہ رک کے مجھے دیکھنے لگیں۔ حیران تھیں کہ انھوں نے مجھے کتنا کھل کے بتا دیا ہے۔ پھر وہ سر ہلا کے بولیں' وہ ایک نرالے دور سے گزر رہے ہیں۔ کل رات وہ گھر آئے ہی نہیں۔ جب آتے ہیں تو مدہوش ہوتے ہیں۔۔۔ وہ انھیں نوکری سے نکال دیں گے پھر خدا جانے یہ کیا کریں گے۔ وہ اس طرح باہر جا کر گندی حرکتیں کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں میں نہیں جانتی۔'

وہ کافی دیر خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں گئے دنوں کا کرب تھا۔ پھر ان کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی' یہی تمھاری مضبوطی ہے' وہ بولیں، ان کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔'تم اپنی خاموشی میں استقامت پاتے ہو۔ تم اسے کم زور نہیں ہونے

دیے۔ اس کے پس منظر میں، میں تمھارے دھڑکتے دل کی ننھی آواز سن سکتی ہوں۔ جب تم یہاں نہیں تھے تب مجھے احساس ہوا کہ میں ہر وقت اسے سنتی تھی۔ تم سمجھ رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تم استقامت سے رہتے ہو جب کہ ہم کم زور پڑ جاتے ہیں۔ اور اس تمام عرصے تمھارا دل صاف رہتا ہے۔ تمھاری بھی کیا گھر واپسی ہوئی ہے۔ میں تو یہ بتانا چاہ رہی تھی اور یہ بھی کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ تمھیں بحفاظت میرے پاس واپس لے آیا۔'

میں نے خاموشی سے کھانا کھایا اور آنسو روکنے کی جدوجہد کرتا رہا کہ میرا یہ نیا، مضبوط اور خاموش طبیعت شخص کا روپ بکھر نہ جائے۔

انھوں نے مہمان کمرے کی کھڑکی بند کی اور ایک کیڑے مار دوا کا چھڑکاؤ کیا۔ ڈی ڈی ٹی کی خوش بو، گرد اور نئی سفیدی کی آمیزش کے ساتھ مل کر میرے حلق کی جلد میں دراڑیں ڈال رہی تھی۔ وہ میری دادی کو دیکھنے گئی تھیں، کہہ گئیں کہ وہ جلد ہی لوٹ آئیں گی۔ جب وہ واپس آئیں تو میرے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گئیں۔ کمرا اتنا مختصر تھا کہ ہم بمشکل چند انچوں کے فاصلے پر تھے۔ انھوں نے ایک گہری سانس لے کر چادر اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔ انھیں یقین تھا کہ جو وہ سننے والی ہیں اس میں انھیں کوئی لطف نہیں آئے گا۔

'میں تیار ہوں' وہ بولیں

'ان کا میری مدد کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا' میں بولا 'یہ انھوں نے میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ انھوں نے بعد میں مجھے خود بھی بتایا تھا لیکن میں وہاں پہنچتے ہی سمجھ گیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں بے وقوف بنوں گا، اور وہ مجھ سے ذرا لطف لے سکیں گے۔ ایسے مت دیکھیے اماں سچ یہی ہے۔ شروع میں تو ان کا نوکر تک مجھ سے ایسے سلوک کرتا تھا جیسے میں کوئی بھکاری ہوں۔ لہٰذا میں نے یہی سوچا کہ کم از کم اپنی تعطیلات تو گزار لوں۔

'اس نے تمھیں خود بتایا کہ اس کا تمھاری مدد کا کوئی ارادہ نہیں تھا' انھوں نے پوچھا۔ مجھے پتا ہے کہ انھیں میری بات پر یقین تھا اور میرے خیال میں انھیں زیادہ حیرت بھی نہیں تھی

'کیا تم نے انھیں وراثت یاد دلائی تھی؟'

'وہ اسے پسند نہیں کرتے' میں بولا 'پھر یقیناً انھیں میرا مذاق اڑانے کا موقع ملتا۔ آپ

اندازہ نہیں کر سکتیں کہ وہ کیسے رہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ درست راستے پر ہیں۔ ان کے خیال میں سب انھیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے نوکری کی پیشکش کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ میں رک کر ان کے لیے کام کروں۔ لیکن میں اس قسم کی زندگی نہیں گزارنا چاہتا تھا۔۔۔ بغیر کچھ کیے پھرتا رہوں، ہمہ وقت مشکوک رہوں۔'

'لیکن تمھیں کہنا چاہیے تھا، تمھیں وراثت کا ذکر کرنا چاہیے تھا' انھوں نے اصرار کیا

'میں نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ سے کسی غیب سے نمودار ہونے والے غریب رشتہ دار کی طرح برتاؤ کر رہے تھے، جو مہربانی کی توقع میں آیا تھا۔ اگر میں آپ کی وراثت کا تقاضہ کرتا تو وہ اسے دیدہ دلیری سے حق جتانا سمجھتے۔ اور اس روز کی بجائے اس سے پہلے ہی نکال چکے ہوتے۔'

'اس نے تمھیں گھر سے نکالا تھا' وہ اچانک غصے میں آ گئیں 'وہ بد گو، احمد، وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ ہمارے بچپن میں بھی وہ ہمیشہ اپنے آپ کو برتر سمجھتا رہا۔ اس کی ہمت کیسے ہوئی؟'

'آپ نے ان کی بیٹی کا ذکر ہی نہیں کیا تھا' میں کوشش کے باوجود اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکا

ان کا غصہ ماند پڑنے لگا۔ حیرت سے ان کا چہرہ نمائشی طور پر کھل گیا 'کیا حرکت کی تم نے؟' اماں نے پوچھا

'میں اسے پسند کرتا ہوں، ایک دن اس سے شادی کروں گا۔'

'میرے خدا تم جس مقصد کے لیے گئے تھے، صرف اسی پر توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ تمھیں اس سے ضرور واسطہ پیدا کرنا تھا۔ کیا کیا تم نے۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟' انھوں نے جواب طلبی کی۔ ان کا پارہ پھر چڑھنے لگا تھا

'میں نے کچھ نہیں کیا تھا، ان کا خیال تھا کہ میں نے کچھ کیا ہے، اسی لیے انھوں نے مجھے باہر نکال دیا۔'

'یہ تمھارا خاندانی مرض ہے' اب وہ غصے سے کانپ رہی تھیں 'تم اسے چند روز کے لیے

نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ تمھیں وہاں جا کر کسی لوفر کی طرح حرکت کرنا ضروری تھی۔ تم جانتے کہ وہ ہمارے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔ تم میرے گھر آ کر ایسی حرکت کرتے تو میں بھی تمھیں نکال دیتی۔ تم لوگوں کو اپنی عزت کا ذرا پاس نہیں تم میں سے کسی کو بھی نہیں؟ تم سب ایک جیسے ہو۔ بالکل اپنے باپ کی طرح، تم سب۔ پھر تم نے یہ طے کر لیا کہ وہ پہلے ہی تمھاری مدد نہ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔'

'میں فرض نہیں کر رہا، حقیقت یہی ہے۔ وہ بالکل میری مدد نہیں کرنا چاہتے تھے' میں نے کہا 'اور وہ بہت خوب صورت ہے۔ اس کا نام سلمٰی ہے، اور وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ اس کی آنکھیں بھوری ہیں اور اس کا چہرہ۔ ۔ ذرا گول اور ہنس مکھ ہے۔ وہ بہت نرمی سے بات کرتی ہے، اور بہت مہربان شخصیت کی مالک ہے۔ وہ بہت ذہین اور پر مغز ہے، اور ایک دن میں اس سے شادی کروں گا۔'

'تم وہاں مدد مانگنے گئے تھے، تاکہ تم زندگی میں اپنے لیے کوئی راستہ بنا سکو۔ تم وہاں شہزادے قمر زماں کا کردار ادا کرنے یا اپنی ماموں زاد کی بے عزتی کرنے تو نہیں گئے تھے۔'

'میں نے کسی کو بے عزت نہیں کیا' میں نے بہت سکون سے انھیں مسکرا کے جواب دیا۔ میں انھیں سلمٰی کے لیے رام کرنا چاہ رہا تھا۔ بتانا چاہ رہا تھا کہ چیزیں جیسی نظر آ رہی ہیں ویسی ہیں نہیں۔ 'کچھ نہیں ہوا تھا۔ ہم چند بار شہر ایک ساتھ گئے تھے اور بہت سی باتیں کی تھیں۔ اگر وہ نہ ہوتی تو مجھ سے اس گھر میں کتے جیسا سلوک ہوتا۔ اس نے اپنے باپ سے بحث کی تھی۔ اپنے باپ کو سمجھایا تھا کہ جو انھوں نے کیا تھا وہ غلط تھا۔ آپ کسی روز اس سے ملیں تو سہی۔ آپ اسے ضرور پسند کریں گی، اماں۔'

'ٹھیک ہے، وہ بہت خوبیوں کی مالک ہے' انھوں نے ہاتھ اٹھا کے مجھے روکا 'لیکن جو تم نے کیا وہ ٹھیک نہیں تھا۔ کسی کے گھر مہمان بن کے جانا اور پھر ایسی حرکت کرنا، یہ تمھاری حرکت غلط تھی۔'

'مجھے معلوم ہے' میں نے کہا 'میں روز اپنے آپ کو یاد دہانی کراتا رہا۔ میں نے بہت کنی کترائی۔ ۔ ۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نکل گیا تو اسے دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گا!'

'لیکن کچھ ہوا نہیں تھا؟' انھوں نے پوچھا

'کچھ نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ میں نے اسے یقین دلایا تھا۔۔۔ اور مجھے پتا ہے کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔'

'تمھیں کیا پتا؟' ان کے خیال میں جتنا میں اسے جانتا تھا اس سے بہت بڑھا چڑھا کے بتا رہا تھا

'اس نے مجھے خط لکھا تھا، اور مجھے تاکید کی تھی کہ میں اسے ضرور لکھوں۔'

'خط لکھنا؟ بالکل مت لکھنا۔ ممکن ہے وہ خط تمھارے ماموں کے ہاتھ لگ جائے؟' وہ بولیں

'اس سے فرق نہیں پڑتا' میں نے کہا 'میں نے انھیں بتا دیا تھا کہ ایک دن میں اسے لینے واپس آؤں گا۔'

وہ مسکرائیں، اور پھر قہقہہ لگایا 'تم مذاق کر رہے ہو؟' وہ بولیں 'کیا بولا تھا وہ؟'

مجھے امید تھی کہ وہ ایسی لڑکی کو نظر انداز نہیں کر سکیں گی جس کے عشق میں، میں گرفتار ہو چکا ہوں۔ میں نے انھیں بتایا کہ جب اس رات ہم نیروبی میں واپس لوٹے تھے تو کیا ہوا تھا۔ میں نے انھیں وہ سب نہیں بتایا جو بوانا احمد نے ابا کے بارے میں کہا تھا۔

'کیا آپ کو پتا تھا اس کی ماں کے بارے میں؟' میں نے پوچھا

'ہاں' وہ ایک توقف کے بعد بولیں 'مجھے پتا ہے کہ وہ طبعی موت نہیں مری تھی'

'اس نے زہر کھا لیا تھا' میں نے کہا تھا

'ہاں' وہ بولیں

'سلمیٰ کو نہیں معلوم مگر دوسرے لوگ جانتے ہیں'

'اس آدمی کی وجہ سے؟'

'نہیں، بلکہ اس کے بعد انھوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا۔ اور شاید اس آدمی کے بارے میں بھی کچھ سچائی نہیں تھی۔'

'سچ ہی رہا ہوگا' وہ رونے لگیں

'جیسے ابا کے بارے میں باتیں سچ ہیں؟ لوگ ان کے بارے میں بھی کہتے ہیں!'

وہ ذرا ٹھٹک گئیں۔ پھر سر ہلا کے مجھے جتایا کہ وہ سمجھ رہی ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔

'شاید اس آدمی کے بارے میں سچ نہ ہو' وہ بولیں 'میں اسے بچپن سے جانتی تھی۔ اس کا تعلق جنجا کے ایک بہت امیر خاندان سے تھا'

'وہ اسی لیے اتنے غصے میں تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں نے بھی وہی کیا جو اس شخص نے کیا تھا۔ ان کے گھر میں گھس کر ان کی بے عزتی کرنا۔ سلمیٰ کو تو نہیں معلوم، انھوں نے اسے نہیں بتایا۔ وہ تو اس کی ماں کا ذکر ہی نہیں کرتے۔ اسے شبہ ہے کہ کچھ گھپلا ضرور ہے لیکن وہ اسے کچھ نہیں بتاتے۔ جو تھوڑا بہت وہ جانتی ہے وہ دوسروں کی زبانی پتا چلا۔ والدین ایسے کیوں ہوتے ہیں۔ آپ بھی مجھے ابا کے متعلق کچھ نہیں بتاتیں۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ میری وجہ سے ایسی ہیں۔ شاید میں نے کچھ کیا ہے جس کی وجہ سے آپ مجھ سے ایسا سلوک کرتی ہیں۔ اس تمام وقت آپ دونوں ان افواہوں کی وجہ سے اتنی تکلیف میں رہے۔'

'اب دوبارہ شروع مت کرو' انھوں نے ملتجیانہ انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

'میں دوبارہ نہیں چھیڑ رہا۔ میں تو بس اس لیے معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کے دکھوں میں اضافہ کیا۔ کیوں کہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا اور میں کچھ سوچا بھی نہیں۔'

'چھوڑو اسے، اس ذکر کو چھوڑو' وہ رونے لگیں 'مجھے اپنی دوست کے بارے میں بتاؤ وہ کیا کر رہی ہے، کام کرتی ہے؟ کیا وہ ہماری زبان بولتی ہے یا صرف انگریزی میں ہی بات کرتی ہے؟'

'بالکل وہ ہماری زبان بولتی ہے، اسے آئس کریم پسند ہے' میں بولا

'ہم یہاں آئس کریم منگوا سکتے ہیں'

ہم رات دیر تک بات کرتے رہے۔ درمیان میں اٹھ کر وہ بی مکسوا کو بھی دیکھتی رہیں۔ اس وقت مجھ پر تھکن سے نیند غالب آنے لگتی، لیکن میں ہر دفعہ ان کے آنے سے پہلے بیدار ہو جاتا تاکہ انھیں پتا نہ چل سکے کہ میں تھکا ہوا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ذکیہ اور میرے والد کی منتظر تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ان فکروں اور پھر ان مزید فکروں کو جو میں اپنے ساتھ لے آیا

تھا اکیلے برداشت کریں۔ بوا نا احمد کی جانب بڑھتے ہوئے غصے کے ساتھ ان کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ انھیں خوشی ہوئی کہ میں نے نوکری کی پیشکش مسترد کردی تھی۔ 'یہ اس کے ساتھ خدا کا انصاف ہے۔ اس نے چند پیسوں کی خاطر تمھارا حق مارا۔ خدا نے اس سے اس کی بیٹی چھین لی۔'

'اب اتنا بڑھا ئیں بھی نہیں' میں نے کہا

'اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں نے ان کی بیٹی ابھی ان سے چھینی نہیں ہے۔ پہلے مجھے دولت اکھٹی کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈنا ہوگا۔ اس وقت تک شاید میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اور وہ بھی شاید کسی اور سے شادی کر لے۔'

'بے وقوف ی کی باتیں مت کرو، کوئی راستہ نکل آئے گا' وہ بولیں

'خاص طور پر اگر خدا اس معاملے میں ہماری طرف داری کر رہا ہے تو!''

'کفر مت بکو' ان کی آنکھیں چمک اٹھیں

آخر ہم دونوں ہی بہت تھک گئے اور اپنی کرسیوں میں اونگھنے لگے

'اب بہت دیر ہو چکی ہے، نصف شب بیت چکی ہے، وہ آج گھر نہیں لوٹیں گے' میں نے کہا 'میں جا کر تالا لگاتا ہوں'

'نہیں' وہ سختی سے بولیں 'میں۔۔۔ میں تالا لگاؤں گی۔'

مجھے معلوم تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی تھیں۔ وہ باہر جا کر صحن میں سو جائیں گی جیسا کہ وہ سالوں سے کر رہی تھیں۔ اور دروازہ مقفل کرنے سے پہلے ان دونوں کے لوٹنے کا انتظار کریں گی۔

'مجھے کل ابا سے اس بارے میں بات کرنی چاہیے۔ اس پورے معاملے پر، انھیں احمد ماموں کا خط ملنے والا ہوگا۔' میں نے کہا

'میں بات کروں گی' وہ بولیں

'میں ڈرتا نہیں ہوں' میں نے احتجاج کیا

'میں تمھارے لیے فکر مند نہیں تھی' وہ بولیں 'میں ان کا سوچ رہی تھی، مجھے بات کرنے دو۔'

وہ دونوں اس رات نہیں لوٹے ۔ دونوں دوسرے روز دن چڑھے واپس آئے ۔ انھوں نے دوسروں سے سن لیا تھا کہ میں واپس آ گیا ہوں۔ ابا تھکے ہوئے لگ رہے تھے، میں دیکھ رہا تھا کہ بے خوابی سے ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ انھوں نے کھلے دل سے میرا استقبال کیا کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو اور میں بس ابھی پہنچا ہوں۔ میں نے ان کی صحت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے قدرے مفصل جواب دیا۔ وہ اس شرمندگی میں الجھے ہوئے تھے کہ میرے مشن کے بارے میں مجھ سے کیسے دریافت کریں۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، میری والدہ انھیں لے گئیں۔ ان کی قسموں اور غصے کی آوازیں آنے لگیں اور پھر میں نے انھیں ہنستے سنا۔ میں نے سوچا تھا کہ ایک کنجوس امیر کی بیٹی سے معاشقہ میرے والد کو پسند آئے گا۔ جب وہ باہر آئے تو اپنی ہنسی روک رہے تھے۔ وہ میرے قریب سے گزر کے جانے لگے، لیکن پھر مڑے اور میرے شانے پہ تھپکی دی۔

'تو ہم نے اس لیے کرایہ ادا کیا تھا؟' وہ ہنستے ہوئے بولے 'کہ تم جا کر معززین کی بیٹیوں کو رجھاؤ، تم نے غلط کیا۔' انھوں نے اپنی آواز دھیمی کر لی 'لیکن اس کنجوس، حرامی کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ اس کا خیال ہے کہ ہم اس قابل نہیں، لیکن تم نے اسے دکھا دیا۔'

'ابا' میں نے مداخلت کی کوشش کی

'اس احمق آلۂ تناسل نے اب دو عورتیں کھو دی ہیں۔ چلو ایک کا تو سمجھ میں آتا ہے کہ بد قسمتی تھی، ٹریجڈی تھی۔ لیکن دو، کس قسم کا احمق ہے وہ؟ اس نے تمھیں وہاں تک صرف مذاق کرنے کے لیے بلایا تھا!'

'ابا' میں نے اپنا ہاتھ ان کی کہنی پر رکھا 'بی مکبوا بہت بیمار ہیں۔ گزشتہ رات ان کی حالت بہت خراب تھی، ہمیں انھیں ضرور ہسپتال لے جانا چاہیے۔'

'وہ نہیں جائیں گی' وہ نرمی سے بولے اور درد کم کرنے کے لیے آنکھیں ملنے لگے 'میں نے کوشش کی ہے، لیکن وہ نہیں جاتیں۔'

'ہمیں دوبارہ کوشش کرنی چاہیے' میں نے اپنی آواز دھیمی کر لی 'یہ شاید ان کا آخری وقت

ہو؟'

انھوں نے مجھے دیکھا اور سوچا کہ منع کریں، مگر پھر اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بہت تھکے ہوئے اور عمر رسیدہ لگ رہے تھے۔ وہ پھر سر ہلا کے دوسری جانب دیکھنے لگے۔

'ہمیں انھیں آج ہی لے جانا چاہیے' میں بولا 'جو آپ کو درکار ہو مجھے بتائیں، لیکن ہمیں ان کو آمادہ کرنا ہوگا کہ وہ ہسپتال چلی جائیں۔'

'ٹھیک ہے' وہ تند خو ہوگئے 'میں جاتا ہوں ان کے پاس۔'

ذکیہ اس وقت آئی جب وہ ان کے پاس تھے۔ وہ مجھے ڈھونڈتی میرے کمرے میں آئی۔ اس کا لباس بجلیاں گرا رہا تھا۔ وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ وہ بہت سادہ لیکن باوقار لگ رہی تھی۔

'سنا ہے تمھاری شادی ہونے والی ہے' اس نے معصومیت سے میرا مذاق اڑایا

میں اٹھ کر اس کی جانب بڑھا تو اس نے خوف زدہ ہو کر دروازے کا پٹ چھوڑ دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں پہ رکھ کے انھیں ہولے سے دبایا۔ 'تم کیا کر رہی ہو؟، تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟'

اس نے کسی بچے کی طرح منہ بسورا اور رونا شروع کر دیا۔ میں نے اسے کمرے کے اندر کھینچ لیا اور اس کے سسکیاں لیتے جسم کو گلے لگا لیا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس کا چہرہ میرے شانے میں دھنسا ہوا تھا۔ میں نے اپنی قمیض اس کے آنسوؤں اور تھوک سے تر ہوتے محسوس کی۔ جب وہ ذرا پر سکون ہوئی تو اس نے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور کوئی لفظ کہے بغیر نکل گئی۔ ۔ میں نے اسے آواز دی لیکن وہ واپس نہ آئی۔ میں اس کے پیچھا بھاگا، لیکن میرے والد نے آواز دی کہ بی مکبوا راضی ہیں۔ میں نے کہا ٹیکسی منگوا لیں، میں بھی چلتا ہوں۔ میں نے ذکیہ کو تلاش کیا مگر میں اسے کھو بیٹھا تھا۔

میں نے ابا کے ساتھ بی مکبوا کو گاڑی تک سہارا دیا۔ میں نے واپس آنے بعد انھیں دیکھا تو وہ بہت بوڑھی اور مختلف لگ رہی تھیں۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور وہ سانس لینے میں ہانپ رہی تھیں۔ میری ماں نے کوشش کی تھی کہ انھیں باہر جانے سے پہلے ذرا صاف ستھرا

کر دیں، لیکن ان کے پاس سے موت کی مخصوص بو آ رہی تھی، پرانے بول و براز کی بو۔ ہم ان کے دونوں طرف بیٹھ گئے، تاکہ وہ کسی طرف لڑھکیں تو انھیں سہارا دے سکیں۔ وہ روتی رہیں، بڑبڑاتی رہیں، لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے تسلی نہیں دی۔

پہلے تو انھوں نے ہمیں لوٹا دیا اور اصرار کیا کہ ہمیں منتظر بیماروں کی لمبی قطار میں شامل ہونا چاہیے۔ میرے والد نرس پر برس پڑے جب کہ مجمع ہمیں تکتا رہا۔ ایک عورت نے نرس کو خبردار کیا کہ اگر بڑھیا مر گئی تو خون اس کے سر پہ ہوگا۔ نرس پہلے ذرا خوف زدہ نظر آیا پھر غصے میں آ گیا۔ اس نے عورت کو اس سختی سے ڈانٹا کہ سارا مجمع اس کے خلاف ہو گیا۔ چاروں جانب سے لعن طعن ہوئی تو وہ جا کر انچارج نرس کو بلا لایا، جس نے بی مکبوا کو فوراً داخل کر لیا۔

میں اُن کے ساتھ ٹھہر گیا جب کہ ابا کام پر چلے گئے۔ میں ان کے پہیوں والے بستر کے ساتھ وارڈ میں گیا جہاں موجود مریضوں کی ترتیب بدلی جا رہی تھی، تاکہ ان کے لیے جگہ بن سکے۔ یہ وارڈ جہنم کا نمونہ تھا۔ دیواریں مٹی اور کالک سے اٹی ہوئی تھیں۔ کھڑکیاں وارڈ کے دروازے کے رخ تھیں اور سب کھڑکیوں کے شٹر غائب تھے۔ بستر ایک دوسرے پر لدے پڑے تھے۔ ان کے درمیان پتلی جگہوں پر برتن اور تھیلے بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں سُتلیوں کی کئی قطاریں تنی ہوئی تھیں، جن میں کبھی مچھر دانی لٹک رہی ہوتی تھی۔ اس وارڈ میں، پیپ اور گلتے اجسام، پرانی قے اور گندے کپڑوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ اور ہر قسم کی ناگوار بو کی آمیزش تھی۔ بیمار جسم لوہے کے بستروں پہ بکھرے ہوئے تھے، کچھ نیم دراز سب دیکھ رہے تھے جب کہ باقی بے خبر پڑے تھے۔

نرسوں نے ایک عورت کو اس کے بستر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک نحیف و نزار بڑھیا تھی، اس نے بلا چوں چرا تعمیل کی۔ اس نے اپنی پرانی پھٹی چادر کو سمیٹا اور اپنے شکستہ جسم کو دروازے کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں گٹھیا سے مڑے تڑے لگتے تھے۔ اس کی گردن جیسے کسی بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ اس کا مدقوق چہرہ یوں زمیں کی جانب جھکا ہوا تھا جیسے کسی گدھ کی چونچ۔ نرسوں نے اس کے خالی بستر کو دیکھ کر منہ بنایا۔ خالی بستر پر دھبے اور مائع لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے گدا الٹ کر میری دادی کو اس پر لٹا دیا۔

کر دیں، لیکن ان کے پاس سے موت کی مخصوص بو آ رہی تھی، پرانے بول و براز کی بو۔ ہم ان کے دونوں طرف بیٹھ گئے، تا کہ وہ کسی طرف لڑھکیں تو انہیں سہارا دے سکیں۔ وہ روتی رہیں، بڑبڑاتی رہیں، لیکن ہم دونوں میں سے کسی نے تسلی نہیں دی۔

پہلے تو انھوں نے ہمیں لوٹا دیا اور اصرار کیا کہ ہمیں منتظر بیماروں کی لمبی قطار میں شامل ہونا چاہیے۔ میرے والد نرس پر برس پڑے جب کہ مجمع ہمیں تکتا رہا۔ ایک عورت نے نرس کو خبردار کیا کہ اگر بڑھیا مر گئی تو خون اس کے سر پہ ہوگا۔ نرس پہلے ذرا خوف زدہ نظر آیا پھر غصے میں آ گیا۔ اس نے عورت کو اس سختی سے ڈانٹا کہ سارا مجمع اس کے خلاف ہوگیا۔ چاروں جانب سے لعن طعن ہوئی تو وہ جا کر انچارج نرس کو بلا لایا، جس نے بی مکیوا کو فوراً داخل کر لیا۔

میں اُن کے ساتھ ٹھہر گیا جب کہ ابا کام پر چلے گئے۔ میں ان کے پہیوں والے بستر کے ساتھ وارڈ میں گیا جہاں موجود مریضوں کی ترتیب بدلی جا رہی تھی، تا کہ ان کے لیے جگہ بن سکے۔ یہ وارڈ جہنم کا نمونہ تھا۔ دیواریں مٹی اور کالک سے اٹی ہوئی تھیں۔ کھڑکیاں وارڈ کے دروازے کے رخ تھیں اور سب کھڑکیوں کے شٹر غائب تھے۔ بستر ایک دوسرے پر لدے پڑ رہے تھے۔ ان کے درمیان تنگ جگہوں پر برتن اور تھیلے بکھرے ہوئے تھے۔ کمرے میں سُتلیوں کی کئی قطاریں تنی ہوئی تھیں، جن میں کبھی مچھر دانی لٹک رہی ہوتی تھی۔ اس وارڈ میں، پیپ اور گلتے اجسام، پرانی قے اور گندے کپڑوں کی بو رچی ہوئی تھی۔ اور ہر قسم کی ناگوار بو کی آمیزش تھی۔ بیمار جسم لوہے کے بستروں پہ بکھرے ہوئے تھے، کچھ نیم دراز سب دیکھ رہے تھے جب کہ باقی بے خبر پڑے تھے۔

نرسوں نے ایک عورت کو اس کے بستر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ وہ ایک نحیف و نزار بڑھیا تھی، اس نے بلا چوں چرا تعمیل کی۔ اس نے اپنی پرانی پھٹی چادر کو سمیٹا اور اپنے شکستہ جسم کو دروازے کی طرف دھکیلنے لگی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں گٹھیا سے مڑے تڑے لگتے تھے۔ اس کی گردن جیسے کسی بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔ اس کا مدقوق چہرہ یوں زمین کی جانب جھکا ہوا تھا جیسے کسی گدھ کی چونچ۔ نرسوں نے اس کے خالی بستر کو دیکھ کر منہ بنایا۔ خالی بستر پر دھبے اور مائع مواد سے لکیریں بنی تھیں۔ انھوں نے گدا الٹ کر میری دادی کو اس پر لٹا دیا۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ ڈاکٹر کب آئے گا۔ انھوں نے جواب میں لاعلمی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہوں تو رک کر انتظار کرسکتا ہوں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جس عورت کو انھوں نے بستر سے نکالا ہے اس کا کیا ہوگا۔ دونوں نرسوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا

'تو کیا ہم اسے واپس لے آئیں؟' ان میں سے ایک نے دریافت کیا

میں نے برآمدے میں انتظار کیا۔ گٹھیا والی بڑھیا وہاں دوسرے مریضوں میں شامل ہوگئی تھی، ڈاکٹر سہ پہر میں آیا، اس نے دادی کا معائنہ کیا اور کہا کہ واپس آکر ان کے ایکسرے کا انتظام کرے گا۔ اس نے سمجھایا کہ وہ وزیرِ سماجیات کے ذاتی طبیب کی حیثیت میں کچھ دنوں کے لیے ڈنمارک جا رہا ہے، جو وہاں ہمارے رہنما کے مجسمے کا آرڈر دینے جا رہا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا ان کا نائب ایکسرے نہیں کرا سکتا، تو اس نے بتایا کہ اس کا کوئی نائب نہیں ہے۔

ہم نے باری باری ان کی تیمارداری کی۔ میرے والد نے سہ پہر میں مجھے فارغ کیا، پھر رات والدہ نے ان کے ساتھ ہسپتال میں گزاری۔ دوسرے روز جب میں برآمدے میں سویا ہوا تھا تو ان کا انتقال ہوگیا۔ نرسوں نے آکر مجھے بتایا اور کہا کہ لاش لے جاؤ کیوں کہ انھیں بستر درکار ہے۔ میں نے اسٹیچر مانگا مگر وہ ان کے پاس نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے جا کر مدد لانی ہوگی اور ایک تابوت بھی۔ انھوں نے مکسوا کی میت وارڈ کے کونے میں ٹھنڈے کمرے میں رکھ دی۔ موت کا پروانہ دستخط کرنے کے لیے کوئی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ بغیر پروانے کے انھیں دفن کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنے والد کو تلاش کیا اور انھوں نے پیسے ادا کر کے ایک نرس سے پروانے پر دستخط کروا لیے۔ ہم ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر میت کو کمبلوں میں لپیٹ کر لے آئے۔ میں نے ان کے انتقال کو عدالت میں جا کر اندراج کرایا، اور قبرستان جانے کی پرچی حاصل کی۔ گورکن کی شکایات میں نے اسے رشوت دے کر رفع کیں۔ ہم نے صحن میں پردہ لٹکا کے کھلے آسمان تلے ان کی میت کو غسل دیا۔ ان کے جسم سے ہر رطوبت نچوڑ کے نکالنے کے بعد انھیں لیونڈر سے حنوط کیا۔ ذکیہ نے آکر اماں کی مدد کی تاکہ تعزیت کے لیے آنے

والوں کے لیے گھر تیار کیا جا سکے۔

ہم نے دوسرے دن ان کی تدفین کی۔ یہ ایک مختصر جنازہ تھا جو ان کی میت کو قبرستان لے گیا۔ شاید نصف درجن لوگ تھے جنہوں نے باری باری کندھا دے کر ان کے جسم کو آخری آرام گاہ تک پہنچایا۔ صرف میری ماں ہی گریہ کناں تھی، اور وہ بھی آخری چند سالوں کی خواری پر۔

زندگی تو چلتی رہتی ہے، میرے والد نے یہ کہہ کر اپنی زندگی کے معمولات پھر بحال کر لیے۔ اب وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ احتیاط برتتے اور وہ پہلے والا جوش وخروش بھی مفقود تھا۔ ان کے اندر کی آگ سرد ہو چکی تھی۔ اب وہ گھر سے آمد و رفت کے وقت اداس اور نادم ہوتے۔ ذکیہ سے انھوں نے کبھی گفتگو نہیں کی۔

اس نے میری نصیحتیں سننے سے انکار کیا۔ اس نے مجھے ایک کمرے کے بارے میں بتایا، جو اس نے کرائے پر لیا تھا۔ اس ماہ کے آخر میں وہ وہاں منتقل ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ اسے یہ تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کمرا کس مقصد کے لیے استعمال ہوگا۔ اس نے مجھے اپنے عاشق کے بارے میں بتایا کہ جو اس کے اخراجات برداشت کرے گا۔

'اس کا اپنا کنبہ ہے، وہ تمھیں اس وقت تک استعمال کرے گا جب تک کہ اس کا دل نہیں بھر جاتا، پھر وہ تمھیں کسی اور کی ملکیت میں دے دے گا۔۔ خدارا عقل استعمال کرو' میں گڑگڑایا۔

'میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں' وہ بولی

'وہ کمرا آخر میں ایک چکلہ بن جائے گا' میں نے اسے شرم دلاتے ہوئے کہا

'بہت بہت شکریہ' وہ تلخی سے بولی 'تم چاہو تو وہاں آکر مجھ سے مل سکتے ہو، اگر تمھیں اس میں شرم نہ محسوس تو!'

'میں ضرور آؤں گا، لیکن تمھیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمھیں اس طرح رہنے کی کیا ضرورت ہے؟'

'مجھے نہیں معلوم' وہ چیخی 'مجھے نہیں معلوم، میں نہیں جانتی۔'

جب اماں کو پتا چلا تو انھوں نے اس سے التجا کی کہ وہ نہ جائے ۔ وہ ذکیہ کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں۔ آنسو ان کے چہرے کو تر کر رہے تھے۔

آخر میں نے اماں کو زبردستی وہاں سے ہٹایا۔ ان کے آہ و زاری کرتے جسم کو اپنی بانھوں میں سمیٹ کے وہاں سے لے گیا۔ ذکیہ اس وقت تو نہیں گئی لیکن مجھے پتا تھا کہ یہ محض وقت کی بات ہے۔ وہ اپنے آپ کو کس روپ میں دیکھتی ہے، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ وہ اپنا کردار خوب نبھا رہی تھی۔ اسی مناسبت سے لباس پہن کر، وہ کولہے مٹکاتی ایک پختہ کار نوجوان رنڈی لگتی تھی۔ پھر بھی جو وہ بن گئی تھی اس پر شرمندہ تھی۔ اس کو سڑکوں پر گشت کرتے دیکھ کر میرے دل کے ہزار ٹکڑے ہو جاتے۔

میں نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ میں نہیں جاؤں گا۔ اس روز حکومت نے آخرِ کار ہمارے نتیجے کا اعلان کر دیا تھا۔ میں نے اپنی توقع سے بہتر نتیجہ حاصل کیا تھا، اتنا اچھا کہ مجھے براہ راست یونی ورسٹی میں داخلہ مل جاتا۔ ہمارے پاس فیس کے پیسے نہیں تھے اور سرکاری اسکالرشپ کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

'یہاں بہت کام مہیا ہے' میں نے کہا۔ اب وہ روز میرے کمرے میں آ کر میرے پاس بیٹھنے لگیں تھیں۔ پہلے تو وہ کچھ نہ بولیں لیکن ان کی آنکھوں میں شکوک تیر رہے تھے، میں اپنی ہنسی نہ روک سکا۔

'یہاں تمھارے کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے' وہ تلخی سے بولیں 'یہاں کیا کرو گے، ہم جیسا بننا چاہتے ہو؟'

'میں ہوں آپ جیسا' میں نے کہا 'میں ٹیچروں کے کالج چلا جاؤں گا۔ میں ایک استاد بن جاؤں گا، وہ وہاں میری دیکھ بھال کریں گے اور آپ کو کوئی فیس بھی نہیں دینی پڑے گی۔ اگر ابا کو اعتراض نہ ہو تو میں گھر پر رہ کر بھی یونی ورسٹی جا سکتا ہوں۔'

'نہیں، نہیں' ان کے چہرے پر دکھ کے آثار نمودار ہو گئے۔ 'تم جا کر جو چاہو مناسب کرو۔ جاؤ کام کاج کرو اور اپنی زندگی گزارو۔ یہاں مت رہو، ہم اپنی دیکھ بھال کر سکتے ہیں۔ اور تم نے سلمٰی کے متعلق جو کہا تھا اسے مت بھولنا۔ اور تم نے کہا تھا کہ تم یہ سب کر کے اسے لینے

جاؤ گے۔ صرف ہمارے لیے یہاں مت رکو، یہ جگہ تمھیں ختم کر دے گی۔'

میں نے کالج میں درخواست دی تو انھوں نے مجھے فوراً ہی قبول کر لیا۔ مجھے آیندہ تدریسی سال یعنی جنوری سے کام شروع کرنا تھا۔ ذکیہ کہنے لگی کہ میں حماقت کر رہا ہوں۔ میری ماں بھی افسوس سے سر ہلانے لگی 'یہاں تمھاری کسے ضرورت ہے؟' انھوں نے پوچھا۔

'آپ کو میری ضرورت ہے' جس حقارت اور طنز سے انھوں نے پوچھا تھا میں اس پر ہنستے ہوئے بولا۔ 'آپ کو میری خاموش استقامت کی ضرورت ہے۔'

'اب تک ہم اس کے بغیر گزارہ کر ہی رہے تھے۔ تم ہمیں جد و جہد کرنے کے لیے چھوڑ دو، ہمیں تمھاری قربانی کی ضرورت نہیں' انھوں نے میرے بازو پر ہاتھ مار کے میری مسکراہٹ روکنے کی کوشش کی 'سن رہے ہو، میں مذاق نہیں کر رہی، جاؤ، جا کر ذرا دنیا دیکھو۔ یہاں کسی کو تمھاری ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس تو اپنے بچوں کے لیے کافی اسکول بھی نہیں تو اساتذہ کی کسے ضرورت ہے؟'

'استاد بننے میں کیا حرج ہے؟ اسکول تو بن ہی جائیں گے، اور پھر اساتذہ کی تو ہمیشہ ہی ضرورت رہتی ہے۔'

'تم سن نہیں رہے ہو' وہ غصے میں آگئیں 'وہ تمھیں اس کالج میں پڑھائیں گے کہ چھوٹے بچوں کو کیسے ہراس کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہو تم؟'

'مجھے بچوں کو ہراس کرنے کی ضرورت نہیں سب اساتذہ ایسا نہیں کرتے۔ میں مفید ثابت ہو سکتا ہوں۔ پھر میں یہاں رہوں گا اپنے لوگوں میں۔'

وہ بار بار اسی موضوع کی طرف لوٹتی رہیں ذکیہ ہمیشہ ان کی حمایت پر کمر بستہ رہتی۔ میرے والد کی موجودگی میں وہ لوگ یہ ذکر کبھی نہیں چھیڑتے۔ وہ خوش تھے کہ میں رک رہا ہوں۔ وہ اکثر میرے مستقبل کی طالبات پر چھڑی استعمال کرنے کے مذاق کرتے۔

'سلمٰی کا کیا ہوگا؟' میری والدہ پوچھتیں

'ہاں، تمھاری منگیتر کا کیا ہوگا؟' ذکیہ پوچھتی

'کون سی منگیتر؟ میں اس کے والد کو کیسے یقین دلاؤں گا کہ میں قابل حقارت سے زیادہ

کوئی شے ہوں۔ وہ سب شاید نیروبی میں موجودگی کے جوش سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ شاید بس ایک بچپنوں کا رومانس تھا۔'

'تم ہو قابلِ مذمت' ڈکی بولی

'اپنے بڑے بھائی سے تمیز سے بات کرو' میری ماں نے اسے ڈانٹا۔ 'وہ تم پر اپنی یہ چھڑی استعمال کر سکتا ہے۔'

مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اپنے پیچھے پڑ جائیں گی، اس بات سے یقیناً خوشی ہوئی کہ وہ میرا اتنا خیال کرتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف میرے لیے مشکل ہو جاتا کہ میں حقیقت سے پردہ پوشی رکھوں۔

'تم محض خوف زدہ ہو' ڈکی بولی۔ وہ اپنے کرائے کے کمرے میں ابھی حال ہی میں منتقل ہوئی تھی، اور میں پہلی بار اس سے ملنے گیا تھا۔ ان تمام برسوں تم جانے کی گفتگو کرتے رہے، اور اب تمہیں ہمت نہیں ہو رہی۔'

'میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔'

'تم صرف خوف زدہ ہو' وہ سر ہلا کے بولی

'ٹھیک ہے، میں ہوں خوف زدہ' میں نے تسلیم کیا 'میں ہمیشہ سے خوف زدہ رہا ہوں۔ کسی دوسری جگہ جانے کے خیال سے کہ جس کے بارے میں مجھے کچھ علم نہ ہو نہ میں کسی کو جانتا ہوں، یہ خیال مجھے بہت خوف زدہ کرتا ہے۔ مجھے ہمیشہ اس بات نے خوف زدہ کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں۔ جانے کے بارے میں اتنا ہنگامہ کرنے کا کیا فائدہ جب کہ زادِ راہ بھی نہ ہو۔ وہاں ایسا کیا رکھا ہے کہ جس کے لیے میں اتنے خطرات مول لوں؟'

'وہی سب جو وہاں ہمیشہ سے تھا۔ ہمت اس اعتقاد کی کہ اگر تم ہمیشہ اپنے چوکوں پر ہی بیٹھے رہو گے تو تمہیں کبھی پتا نہیں چلے گا۔'

میں نے اپنی پرانی جگہوں کی سیر کی عادت دوبارہ شروع کر دی۔ مجھ پر دوبارہ پھر اسی پرانی ناامیدی کے دورے پڑنے لگے۔ نیروبی کا دورہ اب ماضی بعید کی یاد محسوس ہوتا تھا۔ مگر

کو لکھنا مستقل دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ میں صبح تک سوتا پھر دن کی گرمی میں سڑکوں پر پھرتا۔ بستر میں گھنٹوں بے مصرف پڑا رہتا گویا سورج کی گرمی سے فرار تھا۔ میں گھنٹوں اپنے جسم پر مکھیوں کو چلتے دیکھتا تھا، میرے ہاتھوں اور پاؤں سے پسینہ چوسنے والی مکھیاں۔

میں تقریباً روز ہی گودی پر جاتا۔ اب میں بچہ نہیں تھا اور کسٹم گارڈ مجھے پہلے کی طرح روکا نہیں کرتے تھے۔ وہاں دوسرے بھی گھاٹ پر سرگشت کر رہے ہوتے، سمندر میں جھانکتے۔ جہاز سے اترنے والی بلڈنگ کے سامنے ایک ریستوران تھا، جس میں چہل قدمی کرنے والے ٹھنڈا مشروب یا چائے کا پیالہ پی لیتے۔ یہ دکان جو آدمی چلا رہا تھا وہ میرے والد سے واقف تھا۔ انھیں اس وقت سے جانتا تھا جب وہ گودی میں کام کرتے اور ان پڑھ مسافروں کے لیے فارم بھرتے تھے۔ وہ بہت دوستانہ مزاج کا شخص تھا، اور سمندر پر گزارے دنوں کے بارے میں گفتگو کرنے میں اسے بہت لطف آتا۔ اس نے مجھے اپنے بیٹے کے بارے میں بتایا جو چھپ کر جہاز میں ممباسہ سے نکل گیا تھا، اور اب وہیں رہتا ہے۔ میں نے یہ کہانی سن رکھی تھی۔ لیکن وہ کہانیاں بھی کہ جو لوگ پکڑے جاتے ہیں انھیں سمندر میں پھینک دیا جاتا ہے، جب میں نے اسے یہ یاد دلایا تو وہ بہت ہنسا:

‘ایک جہاز پر جہاں میں کام کر رہا تھا، ہمیں ایک بلا ٹکٹ چھپا ہوا شخص ملا۔ اور کپتان نے ہمیں مجبور کیا کہ اسے شارکوں میں پھینک دیں۔ وہ بارادا کا رہائشی کوئی اطالوی کپتان تھا۔ ایک اور دفعہ ایک افریکانڈا تھا، ہم سارے جہاز میں اس کے پیچھے بھاگتے رہے، پھر آخر میں اس نے سمندر میں چھلانگ دی، ہمارے سامنے ہی شارک مچھلیاں اس پر ٹوٹ پڑی تھیں۔’

کچھ راتیں مجھے اس کوے کا خواب آتا جو میں نے بچپن میں دیکھا تھا۔ اس کے پنکھ کاٹ دیے گئے تھے، اور جب بھی وہ اڑنے کی کوشش کرتا تو اس کے پاؤں کے زخمی پنجے زمین پر گھسٹتے۔ وہ درخت درخت ہمارے اسکول کے میدان میں کودتا پھرا، اس کے پیچھے پتھر مارتے بچوں کا ایک ہجوم تھا۔ اس کا اختتام اس وقت ہوا جب اس نے اڑ کے میدان سے اسکول کی عمارت تک جانے کی کوشش کی، تو وہ زمین پر آ گرا، اس کی گردن موت سے پہلے ہی ٹوٹ چکی تھی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ کسی نے وہ کوا میرے تکیے کے نیچے رکھ دیا ہے۔

پہلی رات میں نے کوشش کی کہ بتی جلا کر سو جاؤں۔ میری اماں کمرے میں آ گئیں۔ وہ بستر کے پائنتی بیٹھ کر منتظر رہیں کہ میں سوتا بنے رہنے کی اداکاری ختم کروں۔ بولیں 'میں بتی بجھا دوں یا تمھیں اندھیرے سے بھی ڈر لگنے لگا ہے؟'

'ابا گھر آ گئے؟' میں نے پوچھا

'ہاں اور وہ دھت ہیں' وہ بولیں 'کسی نے رات انھیں مارا ہے، وہ بہت خاموش ہیں۔ مجھے نہیں پتا اس شخص کا کیا حشر ہوگا۔'

'میں جانا چاہتا ہوں، لیکن نہیں معلوم کہ کیسے۔۔۔؟'

وہ منتظر رہیں کہ میں بات جاری رکھوں

'اماں، آپ کچھ بول نہیں رہیں؟'

'تم مجھ سے کیا سننا چاہتا ہو؟ تم بتاؤ میں تمھاری کیا مدد کر سکتی ہوں، اور میں کروں گی۔ اگر تمھیں محض گفتگو ہی کرنی ہے، تو میں تھک چکی ہوں۔ ایک پٹا ہوا آدمی اس گھر کے لیے کافی ہے۔'

'میں چاہتا ہوں کسی جہاز پر کام ڈھونڈ لوں' میں نے کہا 'بابا کچھ لوگوں سے واقف ہوں گے۔۔۔ ہو سکتا ہے وہ کسی سے کہہ سن سکیں۔ جب وہ گودی میں کام کرتے تھے تو وہ ہو سکتا ہے گودی میں کسی کو جانتے ہوں۔ ممکن ہے وہ کسی سے میری سفارش کر سکیں؟'

'ہاں' وہ دکھ سے مسکرائیں 'میں کہوں گی ان سے۔'

ایس۔ایس۔ایلیس

۲۹ اکتوبر ۱۹۶۸

ڈیر سلمیٰ

مجھے اس مرحلے تک آنے میں بہت وقت لگا۔ اور اب جو میں اس مقام پر آ گیا ہوں تو ڈرتا ہوں کہ کیا یہی درست ابتدا ہے۔ یہ اس خط کی ساتویں ابتدا ہے، اور ہر شروعات اپنے سابقہ سے زیادہ بری تھی۔ سات نمبر خوش قسمتی کا نمبر ہے، لہٰذا مجھے امید ہے کہ ہماری خراب ابتدا کے باوجود یہ کامیاب رہے گا۔

اب تمھیں دیکھے ہوئے تین ماہ ہو چکے ہیں، جب میں اپنی شکستوں کے شعلوں میں نیروبی سے نکلا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اب تک تم داخلہ لے چکی ہوں گی۔ اور تمھارے ریلوے ڈپو شہر میں میرے دورے کو یاد کرنے کا وقت بھی نہیں ہوگا۔ (اس بات کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت نہیں، مجھے توقع ہے کہ ہر لحہ تمھارے ذہن میں نقش ہوگا)۔

تم سے بچھڑنے کے دوسرے روز میں مریم سے ملا تھا، ہمارے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ مجھے تو وہ ابھی سے ایک اچھی دوست معلوم ہوتی ہے۔ اس نے مجھے تمھارے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ دوسرے دن وہ تم سے جا کر ملے گی، اور مجھے امید ہے کہ وہ ملی ہوگی اور تمھیں میری محبت کا پیغام دیا ہوگا۔ میں روز تمھارے بارے میں سوچتا ہوں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ لکھوں گا۔ اور میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ جیسے ہی گھر پہنچوں گا فوراً لکھوں گا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی میں حالات کے دباؤ میں آ گیا۔ اس کے بعد تو میں ہمت ہی کھو بیٹھا۔ حالاں کہ میں کوشش کروں تو اس سے کم تکلیف دہ انداز میں بھی یہ بیان کر سکتا ہوں۔ تم مستقبل کی تکمیل کا ایک حصہ ہو۔ لیکن یہاں مجھے اس قدر دکھ نظر آیا کہ جب بھی میں نے ہم دونوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی تو یہ مجھے بہت خود غرضی کی بات لگی۔ میں ایسے حالات میں جانے کے بارے میں سوچ بھی کیسے سکتا تھا؟ میں نے سوچا صرف تمھیں سلام

پہنچانے کے لیے ہی خط لکھ دوں، تا کہ تم مجھے بالکل ہی فراموش نہ کر دو۔ لیکن یہ ایک طرح کی بے وفائی محسوس ہوئی، ایک قسم کی خود غرضی۔ میں ایسا کیسے سوچ سکتا ہوں، بتا نہیں؟ اس لیے کہ میں نے اپنے لوگوں کی تکلیف اور شکست کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ مجھے پرانی بے مقصد عادات سے چمٹے رہنے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ میری دادی کا انتقال ہو گیا اور ہم نے ان کا سوگ تک نہیں منایا۔ جیسے وہ ہمارے ساتھ نہیں رہتی تھیں بلکہ کسی مہمان کی طرح آئی تھیں اور اب اگلی منزل کی جانب چلی گئی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم ہمت ہار رہے ہیں، اور پھر سے اسی پرانی ناامیدی کی شروعات ہونے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ مجھے وہاں ٹھہر کر مفید ثابت ہونا چاہیے۔ میں ان محسوسات کے تحت تمھیں خط نہیں لکھنا چاہتا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ آج ہم نے بمبئی چھوڑ دیا۔ یہ شہر بھی ایک ڈراؤنا خواب ہے۔ پر ہجوم اور پر شور۔ بے تحاشہ گندگی سے بھرا ہوا۔ ہر شخص یا تو چیخ رہا ہوتا، سرگرم نظر آتا یا بھیک مانگ رہا ہوتا۔ مجھے اقرار ہے کہ میں تو شاید ہی بندرگاہ سے باہر نکلا ہوں مجھے اس جگہ سے خوف آ رہا تھا۔ اب شام ہو چکی ہے، اور میں اوپر کے ڈیک پر بیٹھا لائف بوٹ کی روشنی میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ہم نے بمبئی سے بہت سارے مسافر اٹھائے ہیں، زیادہ تر سنگاپور کے مسافر ہیں۔ ہمارے اسباب کے گودام بھر چکے ہیں اور اب سنگاپور پہنچنے تک ان میں کوئی گنجائش پیدا نہیں ہو گی۔ مدراس میں ہم محض چند مسافروں کی خاطر رکے جو ممباسا سے سوار ہوئے تھے۔

یہ ایک بہت گندہ جہاز ہے، اسے گندے، مقامی مسافروں کے لیے تبدیل کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک ڈیک کو ایک بڑے تاریک گودام میں تبدیل کیا گیا ہے۔ جس میں لوہے کے بستر قطار اندر قطار بمشکل ایک گز کے فاصلے پر لگے ہیں۔ ان بستروں پر گدے نہیں، اور کچھ مسافر ننگی اسپرنگ والی چارپائیوں پر ہی سوتے ہیں۔ وہ وہیں سوتے ہیں اور وہیں پکاتے ہیں، ان کے بستر راہ داری میں بچھے ہوتے ہیں، اور چھوٹے تیل کے اسٹوو جلا کر چاول اور لوبیا پکاتے ہیں۔ یہ ایک وحشت ناک جگہ ہے، چند بلب جل رہے ہوں تب بھی تاریک ہی رہتی ہے۔ یہاں سے فضا میں خون اور زخم کی بو آتی ہے، جیسے یہ کسی زمانے میں قید خانے کے طور پر استعمال ہوا ہو۔ اس کے نیچے انسانی نجاست کو سونگھا اور چکھا جا سکتا ہے، اور درمیانی گزرگاہوں

مجھے نیل کے ساحل تک راستہ لو ہوں کے نیس کاٹنا پڑتا۔ شاید جب ہم امیر اور شہرت یافتہ ہو جائیں گے تو دنیا کے اطراف جہاز میں چکر لگائیں گے، اور جہاں ہمارا جہاز رکے گا، میں لوگوں سے واقف ہوں گا۔ ہوسکتا ہے میں تمھارا کسی موٹے، کہیں کے بادشاہ سے تعارف کراؤں، جو مکاؤ میں چرس کا اڈہ چلا رہا ہو۔ یا ہم لارڈ جم سے ملیں جو کہیں پھنس گئے ہوں۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ مشرق ہے اور ایسی چیزیں یہاں ہوتی ہیں۔

میں اپنے گھر، اپنے لوگ اور ان کے حالات کے بارے میں بہت سوچتا ہوں۔ مجھے وہ جگہ چھوڑنے کا بہت دکھ ہے۔ بھلا کون سوچ سکتا تھا؟ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جگہ کو یاد کروں گا، اب مجھے ڈر ہے کہ اسے بالکل ہی بھلا نہ دوں۔ ڈرامہ، مزید ڈرامہ۔ مجھے گھر یاد آرہا ہے۔ مجھے تو وہ بڑھا چٹکلے کا مالک بھی یاد آرہا ہے جو ہمارے پڑوس میں رہتا ہے۔ اتنے مختصر عرصے میں بھی میں کبھی کبھار نام بھولنے لگا ہوں۔ میں سڑکوں کے نام اور مکانوں کے رنگ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں خود کو جلاوطن سمجھتا ہوں۔ اس سے یہ احساس برداشت کرنا آسان ہوجاتا ہے، کیوں کہ اسے میں ایک ایسا نام دے سکتا ہوں جو میرے لیے باعث شرمندگی نہ ہو۔

کیا خط بہت طویل ہو گیا ہے؟ امید ہے کہ یہ بہت بے کیف نہیں ہوگا۔ شاید مجھے شاعری شروع کر دینی چاہیے۔ اگر اس سے کچھ حاصل ہوا۔ شاعری۔ میرا مطلب ہے اسے یوں استعمال کیا جاسکتا ہے کہ ہمیں یہ لگے جیسے ہمارے یہ چھوٹے پست خوف اور محسوسات ایک بڑے اور زیادہ بامقصد کھیل کا حصہ ہیں۔ میں اس میں بھی ناکام ہوں۔ میرے خیال میں یہ فراخ دلی کی ناکامی ہے۔ ایک خودسری ضرورت کہ کوئی خرابی تلاش ضرور کی جائے، کہ ناکامی تلاش کی جائے۔ اور اسے ایسی سخت مزاج بے رحمی سے ڈھونڈا جائے، کہ اس پر بظاہر اعلیٰ ہونے کا شبہ ہو۔ میں تو ورطۂ حیرت میں ہوں کہ میں نے اپنی زندگی کا مختصر دورانیہ کیسے گزارا ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والے کینہ اور سرد مہری کے ساتھ۔ میں اتنے برس اپنے لیے آزردگی جمع کرتا رہا، اور اسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے مصالحے میں بھونتا رہا۔ اپنے شہر میں رہائش مجھے احساسِ جرم میں گرفتار رکھتی، غیر مطلوب، لیکن جیسے یہ میرا ہی قصور ہو۔ یہی احساس

جرم تھا کہ جس نے مجھے خاموشی کے حصار میں گرفتار رکھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس میں سے کتنا تمھیں سمجھ آ رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ مجھے یہ سب تم سے بیان کرنا چاہیے، بہر حال اب تو یہ لکھ دیا ہے اور اب میں اسے تبدیل کرنے والا نہیں۔ شاید یہ سمندر کا اثر ہے۔ یہ اتنا ناقابلِ تحریر حد تک سنسان اور تند خو ہے۔ جب سمندر غصے میں ہوتا ہے تو ہمارا جہاز اس اربوں کیوبک میل کی تخلیق پر یوں اچھلتا ہے، جیسے یہ وجودی حقیقت میں ایک تنکا بھی نہ ہو۔ دوسرے اوقات میں سمندر اتنا پرسکون ہوتا ہے، اتنا حسین، روشن اور چمک دار، اتنا مضبوط اور دغا باز۔ میں تو اپنے پاؤں تلے اچھی، سخت زمین کی آرزو میں مر رہا ہوں۔

میں تمھارے بارے میں خواب دیکھتا ہوں۔ میں مستقل تمھارے بارے میں ہی سوچتا ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب اس طرح ہوگا، اتنا خوب صورت لیکن اتنا درد انگیز۔ مجھے بتاؤ کہ میں بھی کبھی زیادہ دیر تمھاری سوچ سے دور نہیں رہتا۔ تم تک واپس پہنچنے کے لیے بے چین۔

بہت سا پیار

حسن